جون ۲۰۰۸ء

ماہنامہ

میثاق

لاہور

بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

عرض احوال

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرّحیم

دورِ حاضر کا اصل منکر

وطن عزیز پر گزشتہ آٹھ برس ایسے گزرے ہیں کہ ان میں ایک آمر نے ملکی سائمیت اور قومی وقار کو داؤ پر لگا دیا ہے' تمام ملکی ادارے بالخصوص عدلیہ کا نظام تہ و بالا کر کے رکھ دیا ہے' اور امریکی ایجنڈے کی تکمیل میں اسلامی اقدار و روایات کو پوری طرح تلپٹ کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ حالیہ الیکشن میں پاکستانی عوام کا مینڈیٹ فوجی آمریت اور امریکی غلامی کے خلاف تھا' جس کا منطقی نتیجہ یہ نکلنا چاہیے تھا کہ صدر پرویز مشرف صدارت کے منصب سے فی الفور دست بردار ہو جاتے' لیکن الیکشن کے بعد کے حالات نے ثابت کر دیا ہے کہ ان کی حیثیت واقعتاً پاکستان میں امریکہ کے نمائندے اور وائسرائے کی ہے۔ امریکہ ان کی پشت پر ہے اور امریکی سفیرہ صاف صاف کہہ رہی ہیں کہ پرویز مشرف مزید پانچ سال صدر رہیں گے۔ چنانچہ اب جو جمہوری سیٹ اپ بننے والا ہے اس پر امریکہ کا بھرپور دباؤ ہے۔ سرکوزی کا بیان بھی آیا ہے کہ امریکہ کا افغانستان میں رہنا پاکستان کی سائمیت کے لیے ضروری ہے' ورنہ پاکستان تاش کے پتوں کی طرح بکھر جائے گا۔ گویا وہ پاکستان کی سائمیت کو ختم کرنے ہی کے خواب دیکھ رہے ہیں اور ان کا اوّلین ہدف ہماری نیوکلیئر صلاحیت پر پوری طرح کنٹرول حاصل کر کے ہمیں اس سے محروم کر دینا ہے' تاکہ اسرائیل کو اپنے عالمی ایجنڈے کی تکمیل میں کسی خطرے اور رکاوٹ کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

اِس وقت عالمِ کفر مسلمانوں کے خلاف متحد ہے اور اس نے اسلام اور مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کا تہیہ کر رکھا ہے۔ ہمارے لیے لمحۂ فکریہ یہ ہے کہ ہم اللہ پر ایمان رکھتے ہوئے بھی ذلیل و رسوا کیوں ہیں اور دشمن کے مقابلے میں ہماری دعائیں کیوں قبول نہیں ہوتیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ بحیثیت اُمت اللہ تعالیٰ نے ہم پر اقامت دین اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی جو ذمہ داری ڈالی ہے اُسے ہم نے پورا نہیں کیا۔ آج کا اصل منکر وہ باطل نظام ہے جو شیطانی قوتوں نے دنیا پر مسلط کر رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی نصرت وحمایت کے حصول کے لیے ہمیں دنیا کو اس باطل نظام کے پنجۂ استبداد سے آزاد کرانے اور یہاں اللہ کے دین کو قائم

اور غالب کرنے کی بھر پور جدوجہد کرنا ہوگی۔

اس کے علاوہ ہمیں قومی سطح پر جس بہت بڑے منکر کا سامنا ہے وہ صدر پرویز مشرف اور ان کی پالیسیاں ہیں۔ وطن عزیز میں عدلیہ کی بحالی کے لیے وکلاء کی جو تحریک گزشتہ ایک سال سے جاری ہے وہ اسی منکر کے خلاف ہے۔ صدر پرویز مشرف کے ذریعے پاکستان میں امریکی ایجنڈے کی تکمیل اور پاکستان کو عملاً امریکہ کا غلام بنا دینے کا جو عمل شروع ہوا تھا' وکلاء کی یہ تحریک دراصل اس کے آگے بند باندھنے کی کوشش ہے۔ یہ گویا پاکستان کی بقا اور سالمیت کی تحریک ہے۔ وکلاء نے بے سروسامانی کے عالم میں جس طرح اس تحریک کا آغاز کیا اور اس کے لیے قربانیاں دیں اس کے لیے انہیں دادِ تحسین نہ دینا بہت بڑی ناقدری اور ناشکری ہے۔ اس تحریک سے واقعتاً قوم میں بیداری کے آثار پیدا ہوئے ہیں۔ لہٰذا ہم اس تحریک کی بھرپور اخلاقی تائید کرتے ہیں اور اس کی کامیابی کے لیے بارگاہِ ربّ العزت میں دعا کے طالب ہیں۔ البتہ ہم علیٰ وجہ البصیرت اس بات کے قائل ہیں کہ دورِ حاضر کا اصل منکر باطل نظام ہے اور پاکستان کی بقا اور اس کی سالمیت اسلام کے عادلانہ نظام کے قیام سے وابستہ ہے۔ اگر اس ملک میں قرآن وسنت کی بالادستی تسلیم نہیں کی جاتی تو اس ملک کے عوام کو کبھی بھی حقیقی عدل و انصاف میسر نہیں آسکے گا۔

☆☆☆

بانی تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد حفظہ اللہ کا دورۂ ترجمۂ قرآن ''بیان القرآن'' آڈیو/ویڈیو کیسٹس' سی ڈیز اور ڈی وی ڈیز کے علاوہ ٹیلی ویژن چینلز کے ذریعے دنیا کے طول وعرض میں پھیل چکا ہے اور بلا مبالغہ لاکھوں افراد اس سے مستفیض ہو رہے ہیں۔ اس کے باوجود یہ ضرورت شدت کے ساتھ محسوس کی جا رہی ہے کہ ''بیان القرآن'' کو مرتب کر کے کتابی صورت میں پیش کیا جائے۔ چنانچہ کچھ عرصہ قبل ترتیب وتسوید کے بعد ماہنامہ حکمت قرآن میں اس شہرۂ آفاق دورۂ ترجمہ قرآن کی سلسلہ وار اشاعت کا آغاز کر دیا گیا تھا۔ جنوری ۲۰۰۸ء سے حکمت قرآن کے سہ ماہی ہو جانے کے بعد چونکہ اس کی اشاعت میں وقفہ طویل ہو گیا ہے لہٰذا اس سلسلے کو ماہنامہ میثاق میں جاری کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے تاکہ اس سے بہتر طور پر استفادہ کیا جا سکے۔ جولائی 2008ء کی اشاعت سے ان شاء اللہ العزیز سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۶۱ سے دورۂ ترجمۂ قرآن تسلسل کے ساتھ شائع کیا جائے گا۔ oo

فهم حديث

اسلام‘ ایمان اور احسان

حدیثِ جبریلؑ کی روشنی میں (۳)

جامع القرآن‘ قرآن اکیڈمی لاہور میں

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد حفظہ اللہ

کا ۲۲ جون ۲۰۰۷ء کا خطابِ جمعہ

خطبۂ مسنونہ کے بعد:

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ —— بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿وَالْعَصْرِ ① اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ② اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ③﴾ (العصر)

﴿قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰـکِنْ قُوْلُوْۤا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا یَدْخُلِ الْاِیْمَانُ فِیْ قُلُوْبِکُمْ ؕ وَاِنْ تُطِیْعُوا اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ لَا یَلِتْکُمْ مِّنْ اَعْمَالِکُمْ شَیْـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ⑭﴾ (الحُجُرٰت)

’’حدیث جبریلؑ‘‘ کے مطالعہ کے دوران گزشتہ نشست میں اقرارٌ باللسان‘ تصدیق بالقلب اور اعمالِ صالحہ کے ضمن میں کچھ گفتگو ہوئی تھی کہ آیا یہ تینوں چیزیں باہم لازم و ملزوم ہیں یا نہیں۔ میں نے عرض کیا تھا کہ ہمارے ہاں اس بارے میں بہت زیادہ کلامی بحثیں ہوئی ہیں اور مختلف نقطہ ہائے نظر اور گروہ سامنے آئے ہیں۔ ان میں سے ایک طبقہ ’’کرامیہ‘‘ کا تھا۔ اگرچہ یہ فرقہ اب معدوم ہو چکا ہے اور اس نام سے اس کا کوئی وجود نہیں ہے‘ لیکن مسلمانوں کے جہلاء کی اکثریت کا خیال یہی ہے جو کرامیہ کا موقف

تھا‘ کہ ایمان بس اقرارٌ باللسان پر موقوف ہے‘ اگر کچھ اچھے عمل بھی ہو جائیں تو ٹھیک ہے ورنہ صرف اقرارٌ باللسان ہی نجات کے لیے کافی ہے‘ عمل کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ ہی تصدیق بالقلب ضروری ہے۔ اور یہ کہ اقرارٌ باللسان کے ساتھ اگر کوہِ ہمالہ کے برابر بھی گناہ ہوں تو وہ بھی کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ کرامیہ کا موقف پورے مجموعۂ احادیث کو چھوڑ کر صرف ایک حدیث پر مبنی ہے جو بخاری شریف میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور ان کے موقف کو بظاہر حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث نبویؐ سے بھی تقویت ملتی ہے۔ پچھلی نشست میں یہ دونوں احادیث تفصیل سے بیان ہو چکی ہیں۔ اب ظاہر بات ہے کہ ہم صرف ایک حدیث سے پورا استنباط نہیں کر سکتے‘ بلکہ باقی سینکڑوں احادیث بھی پیش نظر رکھنی ہوں گی جن میں ایمان کے ساتھ عملِ صالح کو بھی نجات کے لیے لازم قرار دیا گیا ہے۔ قرآن کریم میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَالْعَصْرِ ① اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ② اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ③﴾

’’زمانے کی قسم! یقیناً انسان خسارے میں ہے۔ سوائے اُن لوگوں کے جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے اور آپس میں حق بات کی تاکید کی اور ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کی۔‘‘

اس اعتبار سے صرف اس ایک حدیث کی بنیاد پر کوئی موقف قائم کر لینا غلط ہے۔ اس ایک حدیث سے استدلال کر لینے سے تو تصدیق بالقلب اور اعمالِ صالحہ تو کیا ایمان بالرسالت بھی ثابت نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ اس میں تو رسول اللہ ﷺ کے یہ الفاظ نقل ہوئے ہیں:

((مَا مِنْ عَبْدٍ قَالَ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ثُمَّ مَاتَ عَلٰی ذٰلِکَ اِلَّا دَخَلَ الْجَنَّۃَ))

’’کوئی شخص ایسا نہیں ہے جو کہے لَا اِلٰہ اِلَّا اللّٰہ‘ پھر اسی پر اس کی موت واقع ہو جائے‘ مگر یہ کہ وہ جنت میں داخل ہوگا۔‘‘

اب یہاں تو صرف توحید ہے‘ رسالت کا اقرار بھی نہیں اور باقی ایمانیات یعنی آخرت‘ ملائکہ‘ کتابوں اور انبیاء علیہم السلام پر ایمان بھی سرے سے زیر بحث نہیں آئے۔ اس لیے اس ایک حدیث ہی کو اپنی گفتگو اور نتائج کا مبنیٰ یا مدار بنا لینا غلط ہے۔ البتہ حضرت

*

انس رضی اللہ عنہ سے جو حدیث نبویؐ مروی ہے اس میں رسالت کا اقرار بھی ہے اور اس کے الفاظ میں ہمہ گیریت بھی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

((مَا مِنْ اَحَدٍ یَشْھَدُ اَنْ لاَ اِلٰـہَ اِلاَّ اللّٰہُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰہِ صِدْقًا مِنْ قَلْبِہٖ اِلاَّ حَرَّمَہُ اللّٰہُ عَلَی النَّارِ)) (۲)

''جو شخص بھی اپنے دل کی گہرائی اور صداقت سے یہ گواہی دے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں تو اللہ تعالیٰ اس پر جہنم کی آگ کو حرام کر دے گا۔''

اس حدیث میں ایک تو رسالت کا اقرار بھی ہے اور دوسرے ''صِدْقًا مِنْ قَلْبِہٖ'' کے الفاظ میں تو معانی کا ایک جہان پوشیدہ ہے' گویا ایک قیامت مضمر ہے۔ اس لیے کہ کوئی شخص اگر سچے دل سے کوئی بات زبان سے نکالے گا تو عمل بھی تو اُس کے مطابق کرے گا۔ اگر اللہ تعالیٰ کو ''صِدْقًا مِنْ قَلْبِہٖ'' (سچے دل سے) مانے گا تو اس کے احکام پر بھی تو چلے گا۔ اسی طرح اگر سچے دل سے اور پختہ ارادے کے ساتھ حضرت محمد ﷺ کی رسالت کا اقرار کرے گا تو آپ ﷺ کی پیروی بھی تو کرے گا۔ البتہ صرف حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث ہمارے استدلال کی بنیاد نہیں بن سکتی۔

دوسرا طبقہ ''اشاعرہ'' کا ہے جن کے نزدیک ایمان اور نجات کے لیے زبان سے اقرار لازم نہیں ہے' صرف دل کی گواہی کافی ہے۔ اس ضمن میں مَیں نے آلِ فرعون کے مؤمن کی مثال دی تھی جن کے بارے میں قرآن میں آیا ہے کہ: ﴿یَکْتُمُ اِیْمَانَہٗ﴾ (المؤمن:۲۸) ''وہ (ایک خاص وقت تک) اپنے ایمان کو چھپائے ہوئے تھے''۔ لیکن جب وقت کے فرعون نے دربار میں قرارداد (resolution) پیش کی کہ: ﴿ذَرُوْنِیْ اَقْتُلْ مُوْسٰی﴾ (المؤمن:۲۶) ''مجھے اب اجازت دو موسیٰ (علیہ السلام) کو قتل کرنے کی'' تو اُس وقت مؤمن آلِ فرعون نے کھڑے ہو کر فرعون اور درباریوں کے سامنے اعلانِ حق کیا اور اپنی مفصل اور مؤثر تقریر سے ایسا سماں باندھا کہ فرعونِ وقت بے بس ہو گیا۔ اس میں بھی ایک امکان کو پیش نظر رکھیے! ہو سکتا ہے کہ مؤمن آلِ فرعون نے بالعموم تو اپنے ایمان کو مصلحتاً خفیہ رکھا ہو لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کو رازدارانہ انداز میں بتا دیا ہو اور انہیں

اس پر گواہ بنالیا ہو! واللہ اعلم بالصواب!

اشاعرہ کے بعد ہمارے ہاں دو طبقے اور ہیں‘ یعنی مُرجئہ اور احناف (احناف سے مراد ہیں امام ابوحنیفہؒ اور اُن کے پیروکار)۔ ان میں سے مُرجئہ کے نزدیک ایمان ’’اقرارٌ باللسان‘‘ اور ’’تصدیق بالقلب‘‘ دونوں کے مجموعے کا نام ہے‘ جبکہ عمل کا ایمان اور نجات سے سرے سے کوئی تعلق نہیں۔ گویا یہ اپنے عقیدے کے اعتبار سے کرامیہ کے پاس پہنچ گئے ہیں۔ اور احناف جو پوری دنیا کے اندر ایک بڑی تعداد میں موجود ہیں‘ اِن کا موقف بھی یہ ہے کہ ایمان نام ہے تصدیق بالقلب اور اقرارٌ باللسان کا‘ اور ’’عمل‘‘ ایک علیحدہ چیز ہے‘ ایک الگ کیٹیگری ہے جس کا ایمان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں ’’علیحدہ‘‘ کا لفظ اس لیے استعمال کر رہا ہوں کہ ان کے نزدیک عمل کا تعلق ایمان سے تو نہیں ہے البتہ نجات کے ساتھ اس کا ایک تعلق ہے۔ اس بنیاد پر مُرجئہ اور احناف کے موقف میں بڑا بنیادی فرق واقع ہو جاتا ہے۔ احناف کے نزدیک اگر کسی کے دل میں ایمان تھا اور اس نے دنیا میں زبان سے اس کا اقرار بھی کیا‘ اس شخص کے اعمال کا جب وزن کیا جائے گا اور اس کی نیکیوں کا پلڑا گناہوں سے بھاری نکلے گا تو ایسا شخص سیدھا جنت میں جائے گا۔ لیکن اگر تصدیق بھی تھی اور اقرار بھی تھا لیکن اعمال میں گناہوں کا پلڑا نیکیوں سے بھاری ہوا تو وہ جہنم میں جائے گا‘ لیکن اپنے گناہوں کے بقدر سزا پا کر اپنے ایمان کی بدولت جو اُس کے دل میں تھا‘ وہاں سے نکال لیا جائے گا اور جنت میں داخل کر دیا جائے گا۔ ان کے نزدیک عمل کا تعلق تو نجات سے ہے لیکن یہ ایمان کا حصہ نہیں ہے۔

ان کے علاوہ ہمارے ہاں چار گروہ ایسے ہیں جن کے نزدیک ایمان تین چیزوں ’’اقرارٌ باللسان‘ تصدیق بالقلب اور عمل صالح‘‘ کا مجموعہ ہے۔ گویا ان کے نزدیک عمل صالح بھی ایمان کا جزو ہے۔ ان میں سب سے نمایاں تو سید المحدثین امام بخاریؒ ہیں‘ اور باقی ائمہ ثلاثہ ہیں‘ یعنی امام مالک‘ امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہم۔ چنانچہ ائمہ اربعہ میں سے بھی تین اِس رائے کے قائل ہیں کہ عمل صالح ایمان کا جزو ہے۔ اس اعتبار سے دیگر گروہ معتزلہ‘ شیعہ اور خوارج ہیں۔ خوارج کہتے ہیں کہ گناہِ کبیرہ سے انسان

*

ایمان اور اسلام دونوں سے نکل جاتا ہے' لہٰذا مرتد قرار پاتا ہے۔ اب اس کا مال اور بیوی بچے مالِ غنیمت ہیں۔ خوارج کے کفر پر تو اُمت کا اتفاق ہے کہ یہ لوگ دائرۂ اسلام سے خارج ہیں۔ معتزلہ اور شیعہ ان کے آس پاس ہیں۔ معتزلہ کے نزدیک گناہِ کبیرہ کی بنیاد پر ایک انسان ایمان سے بھی نکل جاتا ہے اور اسلام سے بھی' لیکن کافر نہیں ہوتا' لہٰذا وہ مرتد شمار نہیں ہوگا۔ وہ مباح الدم اور مباح المال نہیں ہوگا۔ اس حوالے سے ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب کوئی شخص ایمان سے بھی نکل گیا اور اسلام سے بھی نکل گیا تو پھر اس کا مقام کہاں ہے؟ اس لیے کہ اسلام اور کفر کے درمیان کوئی بفر (buffer) زون تو ہے نہیں! کفر اور اسلام کی سرحدیں تو ملی ہوئی ہیں۔ کوئی شخص یا تو اِدھر ہے یا اُدھر۔ تو اس اعتبار سے معتزلہ کا موقف مبہم بھی ہے' غیر معقول بھی ہے اور غیر منطقی بھی۔ البتہ شیعہ کہتے ہیں کہ ایسا شخص پھر منافق ہے۔ لیکن منافق بھی قانونی طور پر تو مسلمان ہوتا ہے۔ تو گویا معتزلہ اور اہل تشیع کا موقف ایک دوسرے کے بہت قریب ہے۔

اس ضمن میں امام المحدثین امام بخاریؒ اور ائمۂ ثلاثہ کا موقف یہ ہے کہ اگرچہ ایمان اور عمل صالح لازم وملزوم ہیں اور عمل صالح ایمان کا جزو ہے' لیکن گناہِ کبیرہ سے کوئی شخص نہ ایمان سے نکلتا ہے اور نہ اسلام سے نکلتا ہے' البتہ وقتی طور پر جبکہ وہ گناہ کر رہا ہوتا ہے' ایمان اس کے دل سے نکل کر اس کے اُوپر منڈلاتا رہتا ہے اور جب وہ گناہ سے فارغ ہوتا ہے تو ایمان پھر واپس آ جاتا ہے۔

اب میں صرف اہل سنت تک اپنی بات کو محدود رکھنا چاہتا ہوں' اس لیے کہ مرجۂ' معتزلہ' اشاعرہ اور کرامیہ تو اَب ہمارے ہاں موجود نہیں ہیں' ان کے بارے میں بات کرنے کی ضرورت نہیں۔ اہل تشیع اگرچہ موجود ہیں' لیکن ان کے بارے میں مَیں زیادہ بات نہیں کرنا چاہتا۔

ہمارے ہاں اہل سنت کے دو ہی طبقے ہیں' یعنی احناف اور اہل حدیث۔ اہل حدیث کے نزدیک سب سے بڑی حجت اور سب سے بڑی دلیل امام بخاریؒ ہیں اور احناف کے نزدیک سب سے بڑی دلیل امام الفقہاء امام ابوحنیفہؒ ہیں' اگرچہ فقہ حنفی امام

ابوحنیفہؒ کے کچھ فتاویٰ کے علاوہ زیادہ تر اُن کے دوشاگردوں قاضی ابویوسف اور امام محمد رحمہما اللہ کے فتاویٰ پر مشتمل ہے۔

احناف اور اہل حدیث کے الگ الگ موقف سامنے آنے کے بعد اِن کے اندر تطبیق کیا ہوگی' یہ ایک بہت باریک اور بہت اہم نکتہ ہے۔اس تطبیق کے ذریعے یہ عقدہ (dilemma) حل ہوجاتا ہے۔امام ابوحنیفہؒ کا جوموقف ہے کہ ایمان تصدیق بالقلب اور شہادت یا اقرار کا نام ہے' تو دنیا میں تو ''تصدیق بالقلب'' کی توثیق (verification) ہو ہی نہیں سکتی۔لہٰذا اِس موقف کی رو سے دنیا کی حد تک ایمان گویا صرف اقرار پر مبنی ہے۔اور امام ابوحنیفہؒ کا یہ موقف بھی بہت واضح ہے کہ گناہِ کبیرہ کے ارتکاب سے بھی کوئی شخص نہ اسلام سے نکلتا ہے نہ ایمان سے' بلکہ وہ مسلمان ہی رہتا ہے۔ان کے نزدیک جہاں تک نفسِ تصدیق کا تعلق ہے تو اس میں نہ اضافہ ہوتا ہے اور نہ کمی ہوتی ہے' بلکہ یہ جامد حیثیت میں برقرار رہتی ہے' لیکن ایمان میں جو حدت اور شدت ہے اس میں کمی یا بیشی ہوسکتی ہے۔چنانچہ اس حوالے سے امام ابوحنیفہؒ کا موقف عام طور پر اِن الفاظ میں بیان کیا جاتا ہے: اَلْاِیْمَانُ قَوْلٌ لَا یَزِیْدُ وَلَا یَنْقُصُ ''ایمان تو قول کا نام ہے جو نہ گھٹتا ہے نہ بڑھتا ہے''۔جبکہ امام بخاریؒ کا موقف ہے: اَلْاِیْمَانُ قَوْلٌ وَعَمَلٌ یَزِیْدُ وَیَنْقُصُ ''ایمان قول اور عمل دونوں کے مجموعے کا نام ہے' یہ گھٹتا بھی ہے اور بڑھتا بھی ہے''۔تو بظاہر احوال اور بظاہر الفاظ یہ دونوں موقف ایک دوسرے کی مکمل ضد معلوم ہوتے ہیں' جو قابل تطبیق (reconcilable) ہیں ہی نہیں۔لیکن یہ دونوں ہی صد فیصد درست ہیں۔آپ حیران ہورہے ہوں گے کہ یہ دونوں موقف صد فیصد درست کیسے ہوسکتے ہیں جبکہ ان کا محل اور مقام ہی جدا ہے!

حقیقت یہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ فقیہہ ہیں۔وہ ایمان کے قانونی پہلو پر بات کررہے ہیں جس کی بنیاد پر کوئی شخص دنیا میں مسلمان سمجھا جاتا ہے۔سورۃ النساء کی آیت ۹۴ کے حوالے سے یہ بات بیان ہوچکی ہے کہ میدانِ جنگ میں بھی اگر کوئی شخص اپنے اسلام کا اقرار کرے تو آپ اُسے یہ نہیں کہہ سکتے کہ ''لَسْتَ مُؤْمِنًا'' (تم مؤمن نہیں ہو)' اس

لیے کہ دنیا میں اسلام کی بنیاد اقرار ہے۔ اس حوالے سے گزشتہ نشست میں حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کا واقعہ بیان ہو چکا ہے کہ ایک کافر سے اُن کا دوبدو مقابلہ ہو رہا تھا‘ وہ کافر آپؓ کی تلوار کی عین زد میں تھا کہ اُس نے کلمۂ شہادت پڑھ لیا۔ حضرت اسامہؓ نے سمجھا کہ یہ تو کلمہ شہادت پڑھ کر محض اپنی جان بچانے کا حیلہ کر رہا ہے‘ لہٰذا آپؓ نے تلوار چلا کر اس کی گردن اڑا دی۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سرزنش فرمائی کہ اے اسامہ! قیامت کے دن کیا کرو گے جب یہ کلمۂ شہادت تمہارے خلاف استغاثہ لے کر آئے گا؟

اس اعتبار سے حضرت امام ابوحنیفہؒ اور دیگر فقہاء کے نزدیک نماز‘ روزہ‘ حج اور زکوٰۃ جو اسلام کے ارکان ہیں اور چوٹی کے اعمال ہیں‘ ان پر عمل نہ کرنے کی بنیاد پر بھی کوئی شخص کافر نہیں ہوتا‘ البتہ ان میں سے کسی کا انکار کر دے گا تو کافر ہو جائے گا۔ مختلف فقہاء کے نزدیک اگر کوئی شخص نماز نہیں پڑھتا تو تعزیر کے طور پر اسے جسمانی سزا دی جائے گی‘ اسے قید کیا جائے گا اور اسے توبہ پر مجبور کیا جائے گا۔ بعض فقہاء کا موقف ہے کہ اسے قتل بھی کیا جا سکتا ہے‘ اس لیے کہ ایک حدیث میں الفاظ آئے ہیں:

((بَیْنَ الرَّجُلِ وَبَیْنَ الشِّرْکِ وَالْکُفْرِ تَرْکُ الصَّلَاۃِ))

’’بندے اور کفر و شرک کے مابین نماز کا معاملہ حائل ہے۔‘‘

لیکن یہ قتل کرنا بھی تعزیراً ہوگا‘ مرتد سمجھتے ہوئے نہیں۔ جیسے شادی شدہ زانی پر حد جاری کر کے اسے رجم کے ذریعے قتل تو کیا جائے گا‘ لیکن اسے مرتد سمجھتے ہوئے نہیں۔ چنانچہ بالعموم عمل کی بنیاد پر تکفیر نہیں ہوگی‘ البتہ بعض اعمال ایسے ہیں جن کے ارتکاب سے تکفیر ہو جائے گی‘ جیسے کوئی شخص شرکِ جلی کا مرتکب ہو رہا ہے‘ مثلاً کسی بُت کو سجدہ کر رہا ہے تو وہ کافر ہے۔

احناف کا جو یہ موقف ہے کہ ایمان ایک جامد حالت میں ہے جو نہ گھٹتا ہے نہ بڑھتا ہے‘ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کی بنیاد پر یا قانونی ایمان کی بنیاد پر دنیا میں ایک شخص کو جو قانونی مرتبہ (legal status) حاصل ہوتا ہے اس میں نہ اضافہ ہوتا ہے نہ کمی ہوتی ہے۔ نیک اعمال سے کسی مسلمان کا مرتبہ اونچا نہیں ہوتا اور برے اعمال سے نیچا نہیں ہوتا۔ کوئی مسلمان اللہ کے ہاں تو اپنے فسق و فجور کی سزا پائے گا‘ لیکن دنیا میں اس کا

مرتبہ (status) برقرار رہے گا۔ قانونی اور دستوری سطح پر سب مسلمان برابر ہیں۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا بہت عالی مرتبت اور بہت اہم قول ہے کہ: **اَلْمُسْلِمُ کُفُوٌ لِکُلِّ مُسْلِمٍ** یعنی ہر مسلمان دوسرے مسلمان کے برابر ہے۔ اس کے لیے میں ایک مثال دیا کرتا ہوں کہ ایک شخص کے دو بیٹے ہیں۔ ان میں سے ایک مؤمن اور متقی ہے، تہجد گزار ہے، شریعت کی پابندی کرتا ہے، جبکہ دوسرا فاسق و فاجر ہے، وہ یا تو نماز پڑھتا ہی نہیں یا کبھی کبھار پڑھ لیتا ہے، اور بس کبھی کبھی شراب بھی پی لیتا ہے۔ اب باپ کے فوت ہونے پر جب وراثت تقسیم ہوگی تو کیا متقی کو زیادہ اور فاسق و فاجر کو کم حصہ ملے گا؟ نہیں، بلکہ برابر برابر ملے گا۔ اس لیے کہ ایک مسلمان کا لیگل سٹیٹس ایک جامد چیز ہے، جس میں نہ کوئی اضافہ ممکن ہے اور نہ کوئی کمی۔ ☆

آج کے دَور میں ایک بڑا اہم مسئلہ یہ ہے کہ اگر اسلامی ریاست قائم ہو جائے، اور اللہ کرے کہ ایسا ہو، تو اس کے سربراہ کا انتخاب کس طریقے سے ہوگا؟ اس کے لیے مشاورت کا کیا نظام ہوگا؟ اگر انتخابات کا طریقہ اختیار کیا جائے تو رائے دہی کا حق کس کو حاصل ہوگا؟ خلافت راشدہ کے دَور میں تو چونکہ قبائلی معاشرہ تھا لہٰذا سربراہِ ریاست کے انتخاب کے لیے قبیلوں کے سردار مل بیٹھ کر جو مشورہ کر لیتے تھے وہی کافی ہوتا تھا۔ لیکن اب قبائلی معاشرہ نہیں ہے، اور خلیفۂ وقت یا سربراہِ ریاست کا انتخاب بھی ضروری ہے، اس لیے کہ وہ آسمان سے تو نازل نہیں ہوگا اور نہ ہی کوئی نبی یا رسول ہوگا، لہٰذا اس کے لیے انتخاب کا کوئی نہ کوئی طریقہ ایجاد کرنا پڑے گا۔ تو اب مسئلہ یہ ہے کہ اس کے انتخاب کا حق صرف متقیوں کو ہوگا یا اس میں فاسق و فاجر مسلمان بھی رائے دے سکتے ہیں؟ لوگوں کے ذہنوں میں اس طرح کا تصور ہے کہ شاید مسجدوں میں رجسٹر کھول دیے جائیں گے اور پنج وقتہ نماز کی حاضری لی جائے گی، اور جو نمازی ہوگا اس کو ووٹ کا حق دار سمجھا جائے گا۔ لیکن ایسی بات نہیں ہے۔ قانونی اور دستوری حقوق (Legal and

☆ اس موضوع پر اللہ تعالیٰ نے مجھے الحمدللہ شرحِ صدر عطا فرمایا ہے اور ''حقیقت ایمان'' نامی کتاب میں اس ضمن میں مفصل مباحث ضبطِ تحریر میں آ چکے ہیں۔

*

5

(Constitutional Rights میں متقی اور فاسق مسلمان بالکل برابر ہیں۔ جیسے فزیالوجی کا ایک قاعدہ: ''All or None Law'' کہلاتا ہے۔ یعنی کوئی چیز ہوگی تو پوری ہوگی اور نہیں ہوگی تو بالکل نہیں ہوگی۔ کمی بیشی والی بات نہیں ہوگی۔ اسی طرح کوئی شخص اسلام کے دائرے میں ہے تو اسے سارے قانونی حقوق حاصل ہیں اور اگر دائرۂ اسلام میں نہیں ہے تو اس کے سارے حقوق ختم ہیں۔ جو بھی اسلام کی سند سے باہر نکلا وہ کافر اور مرتد ہوا' اب اُس کے مسلمان کی حیثیت سے حقوق ختم ہو گئے۔ اس کے نکاح میں اگر کوئی مسلمان خاتون ہے تو اُس سے نکاح فسخ ہو گیا' اب وہ مسلمان باپ کی وراثت میں سے حصہ نہیں پا سکتا۔ تو امام ابوحنیفہؒ کا موقف قانونی ایمان کے حوالے سے ہے۔

اب ہم امام بخاریؒ کے موقف کی طرف آتے ہیں۔ امام بخاریؒ کا موقف حقیقی ایمان یا بالفاظِ دیگر یقین قلبی والے ایمان کی بنیاد پر ہے۔ یہ بڑی منطقی سی بات ہے کہ انسان کا عمل اِس یقین قلبی والے ایمان کے خود بخود تابع ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ وہ یقین ہی کیسا ہوا جس کے تابع عمل نہ ہو! یقین تو بہت دور کی بات ہے' اگر کسی بات پر گمانِ غالب بھی ہوتا ہے تو بھی انسان کا عمل اُس کے تابع ہو جاتا ہے۔ مثلاً سب کو معلوم ہے کہ ہر سانپ زہریلا نہیں ہوتا۔ ہمارے ہاں چوہا خور سانپ مشہور ہے جو چوہوں کو تلاش کر کے ہڑپ کر جاتا ہے اور وہ انسانوں کو نہیں کاٹتا' اور اگر کاٹ بھی لے تو اُس میں زہر نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سے سانپ ہوتے ہیں جو زہریلے نہیں ہوتے۔ اس کے باوجود انسان ہر ایک سانپ سے بچنے کی کوشش کرتا ہے محض اس گمان کی بنیاد پر کہ شاید یہ زہریلا ہو۔ چنانچہ یہ ایک منطقی سی بات ہے کہ انسان کا عمل اس کے ایمان کے خود بخود تابع ہو جاتا ہے۔ قرآن مجید میں جہاں بھی ایمان کا ذکر آیا ہے اس کے ساتھ عمل کا ذکر بھی لازماً ہوا ہے۔ جیسے سورۃ العصر کے الفاظِ مبارکہ ہیں:

﴿وَالْعَصْرِ ۝١ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۝٢ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝٣﴾

''زمانے کی قسم! یقیناً انسان خسارے میں ہے۔ مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور

انہوں نے نیک اعمال کیے اور آپس میں حق بات کی تاکید کی اور صبر کی تلقین کی۔''

اسی طرح سورۃ التین کے الفاظِ مبارکہ ہیں:

﴿وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ ۝ وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ ۝ وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ ۝ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۝ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ۝ ...... ﴾

''قسم ہے انجیر اور زیتون کی' اور طورِ سینا کی' اور اِس پُرامن شہر (مکہ مکرمہ) کی' تحقیق ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا' پھر ہم نے اسے الٹا پھیر کر سب نیچوں سے نیچا کر دیا' سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے' تو اُن کے لیے کبھی ختم نہ ہونے والا اجر ہے......''

تو اس اعتبار سے عمل صالح حقیقی ایمان یا بالفاظِ دیگر یقین قلبی والے ایمان کا جزوِ لاینفک ہے۔ یہ امام بخاریؒ کا موقف ہے اور یہ بھی صد فیصد درست ہے۔ اور یہ یقین قلبی والا ایمان' جیسا کہ میں بتا چکا ہوں' جامد نہیں ہوتا' بلکہ گھٹتا بھی ہے اور بڑھتا بھی ہے' اور اعمالِ سیّئہ کی بنا پر اِس کی نفی بھی ہوتی ہے۔ بے شمار احادیث ایسی ہیں جن میں بتایا گیا ہے کہ فلاں گناہ کرو گے تو ایمان کی نفی ہو جائے گی۔ جیسے یہ حدیث نبویؐ پہلے بھی بیان ہو چکی ہے:

((لَا یَزْنِی الزَّانِیْ حِیْنَ یَزْنِیْ وَھُوَ مُؤْمِنٌ ، وَلَا یَسْرِقُ السَّارِقُ حِیْنَ یَسْرِقُ وَھُوَ مُؤْمِنٌ ، وَلَا یَشْرَبُ الْخَمْرَ حِیْنَ یَشْرَبُھَا وَھُوَ مُؤْمِنٌ))[٤]

''کوئی زانی حالتِ ایمان میں زنا نہیں کرتا' کوئی چور حالت ایمان میں چوری نہیں کرتا اور نہ ہی کوئی شرابی حالت ایمان میں شراب پیتا ہے''۔

اگر کوئی شخص زنا کر رہا ہے یا چوری کر رہا ہے یا شراب پی رہا ہے تو اُس کے ایمان کی کیا قدر و قیمت رہ جاتی ہے؟ آم کے درخت پر اگر آم نہیں لگتے تو کیا فائدہ اُس درخت کا؟ اسے تو کاٹ کر اُس کی لکڑی جلا لی جائے گی۔ وہ ایمان تو پھر دھیلے کا بھی نہیں ہے جس میں عمل صالح کے برگ و بار نہ لگے ہوں' بلکہ گناہ ہی گناہ ہوں! اس حدیث میں تو بڑے گناہوں زنا' سرقہ اور شراب خوری کا ذکر ہے' لیکن ایک حدیث میں تو ایک معمولی سی کج خلقی پر بھی ایمان کی نفی کی گئی ہے۔ ایک موقع پر رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

*

((وَاللّٰهِ لَا یُؤْمِنُ، وَاللّٰهِ لَا یُؤْمِنُ، وَاللّٰهِ لَا یُؤْمِنُ)) ''اللہ کی قسم وہ شخص مؤمن نہیں' اللہ کی قسم وہ شخص مؤمن نہیں' اللہ کی قسم وہ شخص مؤمن نہیں......'' اس پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کانپ گئے کہ کون ہے وہ بدبخت انسان جس کے بارے میں یہ بات کہی جارہی ہے! انہوں نے دریافت کیا: وَمَا ذَاکَ یَارَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ ''اے اللہ کے رسول ﷺ! یہ کون شخص ہے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ((اَلْجَارُ لَا یَاْمَنُ جَارُهٗ بَوَائِقَهٗ))[5] ''وہ شخص جس کی ایذا رسانی سے اس کا پڑوسی چین میں نہیں ہے''۔ یہاں آپؐ نے زنا یا چوری وغیرہ جیسے کسی کبیرہ گناہ کا ذکر نہیں فرمایا' بلکہ محض بدخلقی پر تین بار اللہ عزوجل کی قسم کھا کر کہا کہ ایسا شخص مؤمن نہیں ہے۔ ہمارے فقہاء اِس حدیث کا ترجمہ اِن الفاظ میں کرتے ہیں: ''اللہ کی قسم' اُس شخص کا ایمان کامل نہیں ہے......'' اس لیے کہ مطلقاً ایمان کی نفی سے امام ابوحنیفہؒ کے موقف کی نفی ہو جاتی ہے۔ لیکن آپ سوچیے کہ اس مفہوم سے اس حدیث میں جو زور ہے اس کا تو دھیلہ ہو جاتا ہے! اس لیے کہ ایمانِ کامل تو کسی کسی کو نصیب ہوتا ہے۔ اِس حدیث کے الفاظ میں وہ زور ہے کہ آدمی کانپ جاتا ہے' لیکن اس ترجمے سے اس کا اصل مقصد ختم ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اسے اس کی حالت پر برقرار رکھیے کہ ایسا شخص مؤمن نہیں ہے' اس کے دل میں ایمان نہیں ہے۔ البتہ ایسا شخص کافر بھی نہیں ہے کہ اب مرتد قرار پا کر واجب القتل ہو گیا ہو' بلکہ وہ قانونی طور پر مسلمان ہی ہے' کیونکہ وہ زبان سے اپنے اسلام کا اقرار کر رہا ہے۔ یہ تو خوارج' معتزلہ اور اہل تشیع وغیرہ کا عقیدہ ہے کہ گناہ سے انسان ایمان اور اسلام دونوں سے نکل جاتا ہے۔

یہ جو میں نے بتایا کہ اعمال کی بنیاد پر ایمانِ حقیقی کے اندر کمی بیشی ہوتی رہتی ہے اور بعض اوقات اس کی نفی بھی ہو جاتی ہے' تو اس ضمن میں مَیں قرآن مجید کے تین حوالے پیش کر رہا ہوں۔ غزوۂ اَحزاب کا نقشہ ذرا ذہن میں لائیے۔ یہ بڑا سنگین وقت تھا۔ بارہ ہزار کا لشکر مدینے کو گھیرے ہوئے تھا۔ ایک طرف تو خیر ''حرّات'' تھے جہاں نہ گھوڑا چل سکتا تھا نہ اونٹ' لہٰذا یہ سمت محفوظ تھی' لیکن باقی تینوں اطراف میں دشمنوں کا لشکر تھا۔ مسلمانوں پر کئی دن کا فاقہ تھا۔ یوں سمجھئے کہ مسلمانوں کے ایمان کی آخری درجے میں

آزمائش ہوگئی۔ نتیجتاً منافقین کا نفاق ان کے دلوں سے نکل کر ان کی زبانوں پر آ گیا۔ سورۃ الاحزاب میں ان کے الفاظ نقل ہوئے ہیں:

﴿وَاِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اِلَّا غُرُوْرًا ⑫﴾

''اور (یاد کرو وہ وقت) جب منافقین اور وہ سب لوگ جن کے دلوں میں روگ تھا (صاف صاف) کہہ رہے تھے کہ اللہ اور اس کے رسول نے جو وعدے ہم سے کیے تھے وہ فریب کے سوا کچھ نہ تھے۔''

ہمیں تو اللہ اور اس کے رسول نے سبز باغ دکھا کر اور جھوٹے وعدے کر کے مروا دیا! (نعوذ باللہ)۔ اللہ کے رسول نے تو کہا تھا کہ قیصر و کسریٰ کے خزانے تمہارے قدموں میں ہوں گے☆ اور یہاں یہ کچھ ہو رہا ہے! تو جس نفاق کو وہ چھپائے ہوئے تھے وہ ان کی زبانوں پر آ گیا۔ اس کے برعکس دیکھئے کہ اسی کیفیت میں اہل ایمان کا ردّعمل کس قدر مختلف تھا۔ اس کا نقشہ سورۃ الاحزاب میں بایں الفاظ کھینچا گیا ہے:

﴿وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ ۙ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۡ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّاۤ اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا ㉒﴾ (الاحزاب)

''اور جب سچے مؤمنوں نے لشکروں کو دیکھا تو کہا یہی تو ہے جس کا ہم سے وعدہ کیا تھا اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) نے اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی بات بالکل سچی تھی۔ اس واقعہ نے ان کے ایمان اور سپردگی ہی کو اور زیادہ بڑھایا۔''

یعنی اس آزمائش سے اہل ایمان کے ایمان میں اضافہ ہو گیا اور اہل نفاق کا نفاق ان کی زبانوں پر آ گیا۔ اہل ایمان کے پیش نظر دراصل وہ آیات تھیں جن میں اللہ تعالیٰ نے

☆ ہجرتِ مدینہ کے موقع پر جب سراقہ بن مالک نے رسول اللہ ﷺ کا تعاقب کیا اور اُن کا گھوڑا بار بار زمین میں دھنسا تو آپ ﷺ نے ان کو مخاطب کر کے کہا تھا: ''اے سراقہ! میں کسریٰ کے کنگن تمہارے ہاتھوں میں دیکھ رہا ہوں''۔ چنانچہ دورِ فاروقیؓ میں فتح ایران کے بعد کسریٰ کے زیورات بھی مالِ غنیمت میں آئے اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے کسریٰ کے کنگن حضرت سراقہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں میں پہنائے۔

*

7

مدنی دَور کے شروع میں ہی فرما دیا تھا:

﴿وَلَنَبۡلُوَنَّكُمۡ بِشَیۡءٍ مِّنَ الۡخَوۡفِ وَالۡجُوۡعِ وَنَقۡصٍ مِّنَ الۡاَمۡوَالِ وَالۡاَنۡفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِیۡنَ﴿۱۵۵﴾﴾ (البقرة)

''اور (اے مسلمانو! کمر ہمت کس لو) ہم لازماً تمہیں آزمائیں گے (تمہیں بڑے بڑے امتحانوں سے گزاریں گے) کسی قدر خوف سے اور بھوک (فقر و فاقہ) سے اور مالوں' جانوں اور پھلوں کے نقصان سے۔ اور (اے نبیؐ!) بشارت دے دیجیے (ان آزمائشوں میں) صبر کرنے والوں کو۔''

آزمائش کا یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ کوئی امتحان میں فیل ہوتا ہے اور کوئی پاس ہوتا ہے۔ جیسے عربی کہاوت ہے: اِنَّ فِی الۡاِمۡتِحَانِ یُکۡرَمُ الۡمَرۡءُ اَوۡ یُھَانُ یعنی ''امتحان کے موقع پر یا تو کسی کی عزت افزائی کی جاتی ہے یا اسے ذلیل کیا جاتا ہے''۔

دوسرا مقام سورۃ الانفال کی آیت کریمہ ہے:

﴿اِنَّمَا الۡمُؤۡمِنُوۡنَ الَّذِیۡنَ اِذَا ذُکِرَ اللّٰهُ وَجِلَتۡ قُلُوۡبُهُمۡ وَاِذَا تُلِیَتۡ عَلَیۡهِمۡ اٰیٰتُهٗ زَادَتۡهُمۡ اِیۡمَانًا وَّعَلٰی رَبِّهِمۡ یَتَوَکَّلُوۡنَ ﴿۲﴾﴾

''یقیناً (سچے) اہل ایمان تو وہ لوگ ہیں جن کے دل لرز جاتے ہیں جب (ان کے سامنے) اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے' اور جب ان پر اللہ کی آیات پڑھی جاتی ہیں تو ان کے ایمان میں اضافہ ہو جاتا ہے اور وہ اپنے ربّ پر ہی بھروسہ رکھتے ہیں۔''

جب کوئی مسلمان قرآن پڑھتا ہے تو اگر وہ کج رو نہیں ہے تو اس کے ایمان میں لازماً اضافہ ہوتا ہے جس کا احساس اسے خود بھی ہو رہا ہوتا ہے۔ اسی طرح جب کوئی شخص اہل ایمان کی مجلس میں بیٹھتا ہے تو وہ خود محسوس کرتا ہے کہ اس کے ایمان میں اضافہ ہوا ہے۔ اس کے برعکس جب کوئی شخص غافلین اور اوباش لوگوں کی صحبت میں کچھ وقت گزارتا ہے تو وہ خود محسوس کرتا ہے کہ اگر اس کے پاس ایمان کی کچھ پونجی تھی تو اب اس میں کمی ہو گئی ہے۔ لہٰذا ثابت ہوتا ہے کہ قلبی ایمان جامد شے نہیں ہے' یہ عمل صالح کے ساتھ بڑھتا ہے اور گناہوں کے ساتھ گھٹتا ہے' اور اگر گناہ انسان کا احاطہ کر لیں تو یہ ختم بھی ہو جاتا ہے۔ جیسے ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿بَلٰى مَنۡ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتۡ بِهٖ خَطِيۡٓـئَتُهٗ فَاُولٰٓـئِكَ اَصۡحٰبُ النَّارِ هُمۡ فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ﴿۸۱﴾﴾ (البقرۃ)

''کیوں نہیں! جس شخص نے (جان بوجھ کر) ایک بڑا گناہ کمایا اور اُس کے گناہ نے اس کا احاطہ کرلیا تو ایسے لوگ جہنمی ہیں' جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔''

اب یہاں خلود فی النار کا ذکر ہے جو کافروں کے لیے ہوتی ہے' مسلمان کے لیے تو خلود فی النار نہیں ہے۔ جیسے احناف کی رائے ہے کہ اگر ایمان موجود ہے لیکن اعمالِ صالحہ کا پلڑا ہلکا ہے اور گناہوں کا پلڑا بھاری ہے تو وہ شخص جہنم میں جائے گا لیکن اپنے گناہوں کے بقدر سزا پا کر وہاں سے نکال لیا جائے گا۔ لیکن آیت مذکورہ میں چونکہ ہمیشہ کے لیے جہنم کا ذکر ہے تو ثابت ہوا کہ گناہوں سے ایمان گھٹتا رہتا ہے اور جب گناہ کسی کا مکمل طور پر احاطہ کر لیں تو ایمان ختم بھی ہو جاتا ہے۔ علماء کا ایک بڑا بلیغ قول ہے کہ: اَلْمَعَاصِیْ بَرِیْدُ الْکُفْرِ ''نافرمانی اور گناہ کفر کی ڈاک ہوتے ہیں''۔ یعنی انسان جب مسلسل گناہ کیے جاتا ہے تو وہ گناہ اسے کفر تک لے جاتے ہیں۔

تیسرا مقام سورۃ التوبہ کا ہے جس میں منافقین کا نقشہ بایں الفاظ کھینچا گیا ہے:

﴿وَاِذَا مَاۤ اُنۡزِلَتۡ سُوۡرَةٌ فَمِنۡهُمۡ مَّنۡ يَّـقُوۡلُ اَيُّكُمۡ زَادَتۡهُ هٰذِهٖۤ اِيۡمَانًا‌ ۚ فَاَمَّا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا فَزَادَتۡهُمۡ اِيۡمَانًا وَّهُمۡ يَسۡتَبۡشِرُوۡنَ﴿۱۲۴﴾﴾

''اور جب کوئی سورت نازل ہوتی ہے تو اِن (منافقین) میں سے کوئی (استہزاء کے طور پر) کہتا ہے تم میں سے کس کا ایمان اِس سورت سے بڑھ گیا ہے؟ پس جو لوگ ایمان لائے ان کے ایمان میں اس سورت نے (فی الواقع) اضافہ کر دیا اور وہ (اس سے) بہت خوش ہیں۔''

یعنی کسی نئی سورت کے اترنے پر منافقین کے ایمان میں تو کیا اضافہ ہونا تھا جبکہ ان کے اندر ایمان موجود ہی نہیں تھا' لیکن اس سے اہل ایمان کے ایمان میں یقیناً اضافہ ہوتا تھا۔ جیسے ارشاد ہوا:

﴿هُوَ الَّذِىۡ يُنَزِّلُ عَلٰى عَبۡدِهٖۤ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ لِّيُخۡرِجَكُمۡ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوۡرِ‌ ؕ﴾ (الحدید:۹)

''وہ (اللہ) ہی تو ہے جو اپنے بندے (محمد ﷺ) پر واضح آیات نازل کر رہا ہے
تاکہ تمہیں تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لے آئے۔''

اب اس حوالے سے ایک حدیث نبویؐ پیش خدمت ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

((مَا مِنْ نَبِیٍّ بَعَثَهُ اللّٰهُ فِیْ اُمَّةٍ قَبْلِیْ اِلَّا کَانَ لَهُ مِنْ اُمَّتِهِ حَوَارِیُّوْنَ وَاَصْحَابٌ یَاْخُذُوْنَ بِسُنَّتِهِ وَیَقْتَدُوْنَ بِاَمْرِهِ، ثُمَّ اِنَّهَا تَخْلُفُ مِنْ بَعْدِهِمْ خُلُوْفٌ یَقُوْلُوْنَ مَا لَا یَفْعَلُوْنَ وَیَفْعَلُوْنَ مَا لَا یُؤْمَرُوْنَ))

''اللہ تعالیٰ نے مجھ سے پہلے جس اُمت میں بھی کوئی نبی بھیجا تو اُس کے اپنی اُمت میں سے کچھ اصحاب اور حواری (مددگار) ہوا کرتے تھے جو اپنے رسول کی سنت کو اختیار کر لیتے تھے اور اس کے حکم کی پیروی کرتے تھے۔ پھر ان کے بعد ایسے ناخلف آتے تھے جو کہتے وہ تھے جو کرتے نہیں تھے اور کرتے وہ تھے جس کا انہیں حکم نہیں ہوتا تھا۔''

یہ درجہ بدرجہ زوال ہمیشہ سے چلا آ رہا ہے اور اُمت محمدؐ میں بھی ہوا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بعد تابعینؒ کا دَور آیا' ان کے بعد تبع تابعین کا دَور آیا' جو بہت سنہری اَدوار تھے۔ مرورِ ایام کے بعد یہ ہمارا زوال کا دَور ہے۔ ہمارے قول و فعل میں تضاد پیدا ہو چکا ہے اور ہم وہ کچھ کر رہے ہیں جس کا ہمیں حکم نہیں ہوا۔ یہ جو بدعات پر مبنی رسومات ادا ہو رہی ہیں' مثلاً تیجے ہو رہے ہیں' دسویں' بیسویں اور چالیسویں ہو رہے ہیں' برسیاں ہو رہی ہیں' تو یہ کیا ہیں؟ یہ کس نے بتائی ہیں؟ اللہ اور اس کے رسولؐ نے تو یہ نہیں بتائیں نہ صحابہؓ نے بتائی ہیں۔ یہ عید میلاد النبیؐ جو آج منائی جا رہی ہے یہ نہ صحابہؓ نے کبھی منائی ہے اور نہ تابعین نے' تو ہم یہ کہاں سے لے آئے؟ یہ عیسائیوں کی پیروی ہی تو ہو رہی ہے۔ کرسمس ان کے نزدیک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یومِ پیدائش ہے اور ان کی عید میلاد ہے' تو ہم نے بھی ان کی دیکھا دیکھی اپنے نبی حضرت محمد ﷺ کی عید میلاد منانی شروع کر دی۔ جیسے عیسائی کرسمس کے موقع پر کرسمس کارڈ بھیجتے ہیں ایسے ہی ہمارے لوگ بھی عید الفطر کے موقع پر سو سو روپے کا ایک ایک کارڈ خرید کر بھیجتے ہیں۔ دینی کتابیں خریدنے کے لیے

تو جیب بند ہو جاتی ہے لیکن تہنیت کے کارڈ بھیجے جا رہے ہیں' سالگرہ کے کارڈ بھیجے جا رہے ہیں۔ تو ہم نے دین کے احکام ترک کر دیے ہیں' سنتیں ترک کر دی ہیں' لیکن جس شے کا حکم نہیں ہے وہ کچھ کر رہے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ آگے فرما رہے ہیں:

((فَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِيَدِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ' وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِلِسَانِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ' وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِقَلْبِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ' وَلَيْسَ وَرَاءَ ذٰلِكَ مِنَ الْاِيْمَانِ حَبَّةُ خَرْدَلٍ))(٦)

''تو جو شخص ایسے لوگوں کے خلاف ہاتھ سے (طاقت سے) جہاد کرے گا وہ مؤمن ہے' اور جو شخص ان کے خلاف زبان سے جہاد کرے گا (غلط بات کو غلط کہے گا) وہ بھی مؤمن ہے' اور جو شخص اپنے دل کے ذریعے سے ان کے خلاف جہاد کرے گا (دل میں شدید نفرت رکھے گا) وہ بھی مؤمن ہے۔ اور اس کے بعد تو رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان نہیں ہے''۔

تو یہاں دیکھئے کہ انسان کے طرزِ عمل کی وجہ سے ایمان کی نفیٔ مطلق ہو رہی ہے۔ اگر کسی کے پاس اتنی طاقت نہیں ہے کہ وہ بزور ناخلف اور برے لوگوں کا مقابلہ کر سکے' اور حالات اتنے خراب ہیں کہ وہ زبان کھولنے کی ہمت بھی نہیں کر سکتا تو کم از کم دل میں تو ان کے اعمال سے نفرت رکھے۔ اگر اس کے دل میں بھی نفرت نہیں ہے تو رسول اللہ ﷺ فرما رہے ہیں کہ پھر وہ ایمان سے محروم ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ ظلم و زیادتی کے خلاف ہمت کر کے زبان کھولو۔ اس پر اگر تکلیف آتی ہے تو برداشت کرو۔ یہ جو فرمایا گیا ہے کہ: ﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ﴾ (البقرۃ:۱۵۵) تو یہ محض شاعری تو نہیں ہے (نعوذ باللہ)' بلکہ اللہ کا کلام ہے۔ اور اس سے بھی آگے بڑھ کر طاقت حاصل کرو اور ظالموں اور جابروں کے ساتھ ٹکرا جاؤ۔

ایمان اور عمل صالح کے بارے میں دونوں قابل ذکر موقف بھی آپ کے سامنے آ گئے اور ان میں تطبیق کی صورت بھی آپ کے سامنے آ گئی۔ ایک امام ابوحنیفہؒ کا موقف ہے جو امام الفقہاء ہیں' اور یہ ایمان کے قانونی پہلو سے متعلق ہے کہ ایمان زبانی اقرار اور دلی تصدیق کے مجموعے کا نام ہے اور عمل کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے' بلکہ عمل الگ سے ایک کیٹیگری ہے۔ اور دلی تصدیق کو بھی دنیا میں چونکہ verify نہیں کیا جا سکتا لہٰذا

باقی قول رہ جاتا ہے۔اور یہ موقف صدفی صد درست ہے۔ دوسرا موقف امام المحدثین امام بخاریؒ اور ائمۂ ثلاثہ یعنی امام مالک‘ امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہم کا ہے‘ جو حقیقی ایمان سے متعلق ہے اور یہ بھی صد فی صد درست ہے۔ اِن دومسالک یعنی حنفی مسلک اور اہلحدیث مسلک کی اپنی اپنی جگہ پر بڑی اہمیت ہے۔ یہ بظاہر دو الگ الگ مسلک ہیں لیکن ان کے مابین ایک مطابقت ہے۔اب علماء کرام کا کام ہے کہ ان کے مابین تطبیق پیدا کر کے لوگوں کو دکھائیں۔ ایک ہی کنویں کا مینڈک بن کر بیٹھ رہنے کے بجائے ہمیں چاہیے کہ دوسروں کے مسالک کا مطالعہ کریں اور غور وفکر کریں کہ ان کا موقف کس بنیاد پر قائم ہے‘ ان کا استدلال کیا ہے۔اور یہ کام عوام تو نہیں کر سکتے۔عوام کو تو اِس مشکل دَور میں دو وقت کی روٹی کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔ جیسے امام الہند شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا کہنا ہے کہ اگر کسی معاشرے میں تقسیم دولت کا نظام غلط ہوتا ہے تو اُس کے نتیجے میں وہاں دو طبقے وجود میں آ جاتے ہیں‘ ایک مترفین (haves) اور دوسرے محرومین (have nots)۔ایک طرف ارتکازِ دولت ہو جائے گا‘ دولت کے انبار لگ جائیں گے۔خود لاہور ہی میں اس کا مشاہدہ کر لیجیے کہ کروڑوں روپے کا ایک ایک پلاٹ ہے اور پھر عالی شان کوٹھیاں بنی ہوئی ہیں۔ ڈیفنس‘ ماڈل ٹاؤن‘ گلبرگ وغیرہ میں آپ کو یہ منظر نظر آ جائے گا۔جبکہ دوسری طرف دیکھئے تو بہت بڑی تعداد میں لوگ خطِ غربت سے بھی نیچے زندگی گزار رہے ہیں۔ انتہائی فقر کا عالم ہے۔ کچے مکان اور جھگیاں ہیں جہاں بارش آتی ہے تو اُن کی قیامت ہوتی ہے‘ سردی گرمی آتی ہے تو قیامت ہوتی ہے۔ تو تقسیم دولت کے غلط نظام سے ہمارے ہاں مذکورہ بالا دو طبقات وجود میں آ چکے ہیں۔ تقسیم دولت کا غلط نظام دودھاری تلوار ہے۔ جدھر پیسے کا ارتکاز ہو جاتا ہے وہاں عیاشی اور بدمعاشی ہوتی ہے‘ دولت کا بے جا اظہار ہوتا ہے‘ گویا یہ شیطان کے چیلے ہیں۔اور جہاں فقر و فاقہ ہوتا ہے تو انسان حیوانوں کی سطح پر آ جاتے ہیں‘ جیسے لدّو اونٹ یا بار برداری کے جانور ہوں۔اب ان سے کیا توقع لگائی جا سکتی ہے کہ وہ اللہ سے لو لگائیں گے! بقول شاعر: ؎

دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا
تجھ سے بھی دل فریب ہیں غم روزگار کے!

اِن بے چاروں کے لیے پیٹ بھرنا تو کیا جسم وجان کا رشتہ برقرار رکھنا بھی تقریباً ناممکن سا ہو گیا ہے۔ ایک حدیث نبویؐ میں تو فرمایا گیا ہے کہ: ((کَادَ الْفَقْرُ اَنْ یَّکُوْنَ کُفْرًا))(۷) ''قریب ہے کہ فقر انسان کو کفر تک لے جائے!''

اس اعتبار سے مسلکوں کے مابین باہمی تطبیق پیدا کرنا بہت ضروری اور بہت عظیم کام ہے۔ اس سے فرقہ واریت کی شدت کم ہو گی اور تلخی ختم ہو جائے گی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

اقول قولی ھذا واستغفر اللّٰہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات oo

(مرتب: طارق اسمٰعیل ملک' ادارتی معاون)

حواشی

(۱) صحیح البخاری' کتاب اللباس' باب ثیاب البیض۔ وصحیح مسلم' کتاب الایمان' باب من مات لا یشرک باللّٰہ شیئا دخل الجنۃ......

(۲) صحیح البخاری' کتاب العلم' باب من خص بالعلم قوما دون قوم کراھیۃ ان لا یفھموا۔ وصحیح مسلم' کتاب الایمان' باب الدلیل علی ان من مات علی التوحید دخل الجنۃ قطعاً۔

(۳) صحیح مسلم' کتاب الایمان' باب بیان اطلاق اسم الکفر علی من ترک الصلاۃ۔ ترمذی کی روایت میں الفاظ ہیں: ((بَیْنَ الْکُفْرِ وَالْاِیْمَانِ تَرْکُ الصَّلَاۃِ))

(۴) صحیح البخاری' کتاب المظالم والغصب' باب النھبی بغیر اذن صاحبہ۔ وصحیح مسلم' کتاب الایمان' باب بیان نقصان الایمان بالمعاصی ونفیہ عن المتلبس۔

(۵) مسند احمد۔

(۶) صحیح مسلم' کتاب الایمان' باب بیان کون النھی عن المنکر من الایمان......

(۷) رواہ البیھقی فی شعب الایمان۔ بحوالہ مشکاۃ المصابیح' کتاب الآداب۔ والسلسلۃ الضعیفۃ للالبانی: ۴۸۰ و ۱۹۰۵۔

*

1

زُہد وقناعت

اُسوۂ رسولؐ کی روشنی میں

عتیق الرحمٰن صدیقی

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

((مَالِیْ وَمَا لِلدُّنْیَا ، مَا اَنَا فِی الدُّنْیَا اِلَّا کَرَاکِبٍ اسْتَظَلَّ تَحْتَ شَجَرَۃٍ ثُمَّ رَاحَ وَتَرَکَھَا)) (۱)

''مجھے دنیا سے کیا سروکار؟ میرا دنیا سے واسطہ بس اتنا ہی ہے جیسے کوئی مسافر راہ میں تھوڑی دیر کے لیے کسی درخت کے سایہ میں دم لے لے' پھر اس کو چھوڑ کر اپنی راہ لے''۔

کیا شان بے نیازی ہے اور کیا شانِ استغنا ہے انسانیت کے اس عظیم ترین محسن کی جو سرورِ عالم ہوتے ہوئے بھی بوریہ نشین ہے' جو جمال وکمال کے عالی شان مرتبے پر فائز ہوتے ہوئے بھی فقر وغنا کی دلربا تصویر ہے۔ وہ میرا اُمم ہے مگر قبائے عجز اس کے لیے وجہ افتخار ہے۔ بقول شاعر:

فرشِ زمیں پہ ایک چٹائی بچھی ہوئی
بیٹھے ہیں اس پہ شاہِ عربؐ سید عجمؐ
نانِ شعیر بھی تو میسر نہیں ہوئی
باندھے ہوئے ہیں پیٹ پہ پتھر شہ اممؐ

حضرت عمرؓ نے رسول اللہ ﷺ کو ایک مرتبہ چٹائی پر اس حالت میں لیٹے ہوئے دیکھا کہ آپؐ کے پہلو میں اس کے نشانات پڑ گئے تھے' یہ منظر دیکھ کر ان کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔ آپؐ نے دریافت فرمایا: ''کیا بات ہے؟'' انہوں نے عرض کیا: یارسول اللہ! آپؐ اللہ کی مخلوق میں سب سے برگزیدہ ہیں اور عیش کسریٰ اور قیصر کر رہے ہیں! یہ سن کر آپؐ کا چہرہ

(۱) سنن الترمذی' کتاب الزھد عن رسول اللہ ﷺ' باب ما جاء فی اخذ المال بحقه۔

سرخ ہو گیا اور فرمایا: ''ابن الخطاب! کیا تمہیں کچھ شک ہے؟'' پھر آپؐ نے ارشاد فرمایا: ''یہ وہ لوگ ہیں جن کو دنیا کی زندگی کے سارے مزے یہیں دے دیے گئے ہیں''۔ (بخاری و مسلم)

حضور نبی کریم ﷺ کی زندگی توسط و اعتدال سے عبارت تھی۔ آپؐ کو ایسا طرزِ معیشت پسند تھا جس میں توازن ہو۔ آپؐ اہل بیت کے لیے بھی زندگی کا ایسا ہی معیار پسند فرماتے تھے۔ آپؐ کی دعا تھی: ((اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ رِزْقَ آلِ مُحَمَّدٍ قُوْتًا)) ''اے اللہ! آلِ محمد کا رزق بقدرِ ضرورت ہو''۔ (بخاری و مسلم) رسول اللہ ﷺ کی زندگی کا مرکز و محور یہ نقطہ تھا: ((اَللّٰھُمَّ لَا عَیْشَ اِلَّا عَیْشُ الآخِرَۃِ)) ''اے اللہ! اصل زندگی تو آخرت کی زندگی ہے''۔ (بخاری و مسلم) یہی وجہ ہے کہ آپؐ دراہم و دنانیر اور دنیا کے مال و متاع کو ثانوی حیثیت دیتے تھے۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے آپؐ نے ایک موقع پر فرمایا: ''مجھے یہ گوارا نہیں کہ میرے پاس اُحد پہاڑ کے برابر سونا ہو اور تین دن گزر جائیں اور اس میں سے ایک دینار بھی میرے پاس باقی رہے' سوائے اس کے کہ کسی دینی کام کے لیے میں اس میں سے کچھ بچا رکھوں' ورنہ اللہ کے بندوں میں مَیں اس کو اِس طرح اور اس طرح دائیں بائیں اور پیچھے لٹا دوں''۔ (نبی رحمت ﷺ' بحوالہ بخاری)

رسول اللہ ﷺ کی نگاہ میں متاعِ دنیا کی اہمیت تھی تو ایک مناسب حد تک' اور اگر بے زاری اور بے رغبتی تھی تو وہ بھی ایک معقول دائرے میں۔ گویا آپؐ ((خَیْرُ الْاُمُوْرِ اَوْسَطُھَا)) کے مصداق تھے۔ یہی کمالِ زہد ہے جس میں افراط و تفریط اور غلو کا کوئی شائبہ تک نہیں۔ لغوی اعتبار سے زہد کے معنی قلت اور حقارت کے ہیں۔ صاحب قاموس نے زہد کے لغوی معنی ضِدُّ الرَّغْبَۃِ (رغبت کی ضد) بتائے ہیں۔ امام راغب اصفہانی مفردات القرآن میں لکھتے ہیں: ''الزھید کے معنی حقیر چیز کے ہیں اور کسی چیز سے بے رغبتی کرنے والے یا حقیر سی چیز پر راضی ہو جانے والے کو ''زاھد فی الشیء'' کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے: ﴿وَکَانُوْا فِیْهِ مِنَ الزّٰھِدِیْنَ﴿۲۰﴾﴾ (یوسف) [اور اس کے بارے میں وہ بے رغبت تھے]''

زہد کے اصطلاحی اور شرعی معنی ابویحییٰ زکریا انصاریؒ نے ان الفاظ میں بیان کیے ہیں:

هو الاعراض بالقلب عن الدنيا وهو رأس كل طاعة لانه ضد حب الدنيا الذى هو رأس كل خطيئة

''زہد دنیا سے قلبی اعراض کو کہتے ہیں اور یہ ہر طاعت کی اصل ہے' کیونکہ یہ حُبّ دنیا کی ضد ہے جو ہر خطا و گناہ کی جڑ ہے''۔ (شرح رسالہ قشیریہ بحوالہ اسلامی تصوف)

*

شیخ الاسلام زکریا انصاری کی اس تعریف سے عیاں ہوتا ہے کہ زہد کے لیے مال اور اسبابِ دنیا سے بے رغبتی کافی ہے‘ متاعِ دُنیا کو اپنے اوپر مستولی کر لینا ہی خرابیوں کی جڑ ہے۔ قرآن وحدیث میں اگر ایک طرف دُنیوی مال واسباب کو حقیر قرار دے کر اس کی مذمت کی گئی ہے تو دوسری طرف مال کے لیے خیر کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور اس کی ضرورت واہمیت کو تسلیم کیا گیا ہے۔ ان آیات واحادیث میں اس وقت موافقت اور تطبیق پیدا ہو جاتی ہے جب ہم دونوں نقطہ ہائے نظر میں مثبت پہلوؤں کو اجاگر کریں۔ بے شک اس دنیا کو مطعون کیا جائے جو اللہ کے ذکر سے غافل کر دینے والی ہو اور انسان اس میں محو ہو کر حقیقی مقصد زندگی کو فراموش کر دے۔ مولانا روم فرماتے ہیں کہ:

چیست دنیا؟ از خدا غافل بدن
نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

’’دنیا کیا ہے؟ خدا سے غافل ہونا۔ سامان اور چاندی اور زن وفرزند کا نام دنیا نہیں ہے‘‘۔

دنیا کن معنوں میں مذموم ہے اور کس پہلو سے وہ مذموم نہیں‘ مولانا روم نے مذکورہ شعر میں اسی بات کو واضح کیا ہے۔

قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْھِکُمْ اَمْوَالُکُمْ وَلَآ اَوْلَادُکُمْ عَنْ ذِکْرِ اللّٰہِ ۚ وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝﴾ (المنٰفقون)

’’اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تمہارے مال اور تمہاری اولادیں تم کو اللہ کی یاد سے غافل نہ کر دیں۔ اور جو لوگ ایسا کریں گے وہی اصل میں خسارے میں رہنے والے ہیں‘‘۔

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اس آیۂ کریمہ کے ضمن میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

’’مال اور اولاد کا ذکر تو خاص طور پر اس لیے کیا گیا ہے کہ انسان زیادہ تر انہی کے مفاد کی خاطر ایمان کے تقاضوں سے منہ موڑ کر منافقت یا ضعف ایمان یا فسق ونافرمانی میں مبتلا ہوتا ہے‘ ورنہ درحقیقت مراد دنیا کی ہر وہ چیز ہے جو انسان کو اپنے اندر اتنا مشغول کر لے کہ وہ خدا کی یاد سے غافل ہو جائے۔ یہ یادِ خدا سے غفلت ہی ساری خرابیوں کی اصل جڑ ہے۔ اگر انسان کو یہ یاد رہے کہ وہ آزاد نہیں ہے بلکہ ایک خدا کا

بندہ ہے' اور وہ خدا اُس کے تمام اعمال سے باخبر ہے اور اس کے سامنے جا کر ایک دن اسے اپنے اعمال کی جواب دہی کرنی ہے تو وہ کبھی کسی گمراہی و بدعملی میں مبتلا نہ ہو اور بشری کمزوری سے اس کا قدم اگر کسی وقت پھسل بھی جائے تو ہوش آتے ہی وہ فوراً سنبھل جائے''۔ (تفہیم القرآن' جلد پنجم)

حضرت ابوالعباس سہل بن سعد الساعدی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک آدمی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: یارسول اللہؐ! مجھے ایک ایسا عمل بتائیں جس پر میں عمل کروں تو اللہ تعالیٰ بھی مجھ سے محبت کرے اور لوگ بھی مجھ سے محبت کریں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اِزْهَدْ فِي الدُّنْيَا يُحِبُّكَ اللّٰهُ وَازْهَدْ فِيمَا اَيْدِی النَّاسِ يُحِبُّوكَ))

(سنن ابن ماجه' كتاب الزهد)

''دُنیا سے زہد اختیار کر' اللہ تعالیٰ تجھ سے محبت کرے گا اور جو کچھ لوگوں کے پاس ہے اس سے بے رغبتی اختیار کر' لوگ تیرے ساتھ محبت کریں گے''۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اس اُمت کی صلاح کی اوّلین شے یقین اور زہد ہے اور اس کی فساد کی اوّلین شے بخل اور اَمل ہے''۔ (مشکوٰۃ بحوالہ بیہقی)

مذکورہ حدیث میں یقین کے مقابلے میں بخل اور زہد کے مقابلے میں اَمل کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ دراصل آخرت کا عقیدہ جب کمزور پڑ جاتا ہے اور آدمی حبّ دنیا کا شکار ہو جاتا ہے تو وہ بخل کی رذیلت سے دوچار ہو جاتا ہے اور اللہ کے مقرر کردہ حقوق کی پاسداری نہیں کرتا اور جب زہد ختم ہو جاتا ہے تو دنیا کی جانب میلان بڑھنے لگتا ہے اور انسان متنوع قسم کی امیدوں اور آرزوؤں میں الجھ جاتا ہے۔

حضرت ابوادریس خولانیؒ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اَلزَّهَادَةُ فِي الدُّنْيَا لَيْسَتْ بِتَحْرِيمِ الْحَلَالِ وَلَا اِضَاعَةِ الْمَالِ ' وَلٰكِنَّ الزَّهَادَةَ فِي الدُّنْيَا اَنْ لَا تَكُونَ بِمَا فِي يَدَيْكَ اَوْثَقَ مِمَّا فِي يَدَيِ اللّٰهِ))

(سنن الترمذی و سنن ابن ماجه)

''دنیا میں زہد حلال کو حرام کرنے اور مال کو ضائع کرنے کا نام نہیں ہے' بلکہ دنیا میں زہد یہ ہے کہ تمہارے پاس جو کچھ ہو اُس پر بھروسے کے بجائے تمہیں زیادہ اعتماد اس چیز پر ہو جو اللہ کے پاس ہے''۔

*

حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''دنیا میں زہد موٹے اور سخت کپڑے پہننے اور روکھا پھیکا کھانے کا نام نہیں ہے' بلکہ دنیا میں زہد موت اور آخرت سے غافل کرنے والی امیدوں اور آرزوؤں کو ختم کرنے کا نام ہے''۔(مشکوٰۃ' بحوالہ شرح السنۃ)

یہی بات امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے بھی فرمائی ہے۔ زید بن حسیل کہتے ہیں کہ جب امام مالکؒ سے سوال کیا گیا تھا کہ دنیا میں زہد کس چیز کا نام ہے؟ تو انہوں نے کہا کہ ''حلال اور پاک کمائی اور قصرِ اَمل یعنی دُنیوی آرزوؤں کی کمی!'' (مشکوٰۃ بحوالہ بیہقی)

انڈیا کے معروف عالم سید احمد عروج قادری اپنی کتاب ''اسلامی تصوف'' میں امام قشیریؒ کے حوالے سے صوفیاء کے ایک گروہ کا قول نقل کرتے ہیں:

> ''زہد صرف حرام میں ہوتا ہے' اس لیے کہ اللہ سبحانہٗ نے حلال کو اپنے بندوں کے لیے مباح قرار دیا ہے۔ جب اللہ نے کسی بندے کو مالِ حلال مرحمت فرمایا اور اس مال میں اس پر شکر کو واجب قرار دیا تو جس مال کو رکھنے کی اجازت اللہ نے دی اس کو اپنے اختیار و پسند سے چھوڑ دینا کس طرح قابل ترجیح ہوگا؟'' (اسلامی تصوف)

شیخ الاسلام تشریح کرتے ہیں کہ:

> ''اس قول کی بنا پر مال کو ترک کر دینا زہد نہیں ہے''۔(ایضاً)

امام المحدثین امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں:

> ''زہد کی تین اقسام ہیں: (ا) ترکِ حرام' یہ عوام کا زہد ہے۔ (ب) حلال میں سے زائد شے کو چھوڑ دینا' یہ خواص کا زہد ہے۔ (ج) ہر ایسی شے ترک کر دینا جو توجہ الی اللہ سے روکنے والی ہو' یہ عارفین کا زہد ہے''۔

حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت کردہ ایک حدیث مبارکہ جس سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے محاسن اخلاق اور مکارمِ عادات پر روشنی پڑتی ہے' کا ایک مختصر ٹکڑا یوں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ((وَالْعِجْزُ فَخْرِیْ وَالزُّھْدُ حِرْفَتِیْ)) یعنی ''عاجزی میرا فخر ہے اور زہد میرا پیشہ ہے''۔(تخریج الاحیاء للعراقی)۔ اس جملے کی وضاحت کرتے ہوئے قاضی محمد سلیمان منصور پوری لکھتے ہیں:

> ''حرفہ تو اس طریقہ کو کہتے ہیں جسے انسان اپنی معاش کے لیے لازم ٹھہرائے' اور یہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے 'زہد' ہی کو اپنا حرفہ بتلایا تو اس کے معنی یہ ہو گئے کہ اپنی توجہ کو ان سب اشیاء جملہ اسباب اور وسائل سے جو ماسوی اللہ کی طرف لے جانے والے ہیں' ہٹا کر پورے

اہتمام اور پوری ہمت سے اللہ ہی کی طرف توجہ کر لی جائے' وسائل و وسائط کو ہیچ پوچ سمجھ لیا جائے۔ وہ اعتماد پروردگار پر ہے سامانِ حاضرہ کو موجب طمانیت نہیں بنا سکتا اور اسی سامان کا فقدان قلب میں کوئی تشویش نہیں پیدا کر سکتا...... یہ زہد کی بلند ترین صورت ہے اور اس زہد پر یہ اعتراض بھی عائد نہیں ہو سکتا کہ زہد تو اکتسابی ذرائع کا مانع ہے یا زہد تو اصولِ تمدن کی مخالفت کا نام ہے''۔ (رحمۃٌ للعالمین' جلد سوم)

اسلام کے بنیادی عقائد و اعمال اس امر کا واضح ثبوت ہیں کہ دین کا مزاج رہبانیت سے متصادم ہے۔ حضور نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں: ((لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْإِسْلَامِ)) (نیل الاوطار) ''اسلام میں کوئی رہبانیت نہیں''۔ حضرت عثمان بن مظعون نے جب خصی ہونے کی اجازت طلب کی تو آنحضرت ﷺ نے انکار کرتے ہوئے فرمایا: ((اِنَّ اللّٰهَ اَبْدَلَنَا بِالرَّهْبَانِيَّةِ الْحَنِيفِيَّةَ السَّمْحَةَ)) (طبرانی) یعنی ''ہمیں اللہ تعالیٰ نے رہبانیت کے بجائے خالص ابراہیمی دین عطا فرمایا ہے''۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے عیسائیوں پر جنہوں نے کہ دین کو رہبانیت اور خدا پرستی کا کمال سمجھ کر اپنا رکھا تھا' تنقید کرتے ہوئے فرمایا کہ: ﴿وَرَهْبَانِيَّةَ نِ ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ﴾ (الحدید:۲۷) ''انہوں نے رہبانیت کی خود ساختہ راہ اختیار کر لی' ہم نے انہیں اس کا حکم نہیں دیا تھا''۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ نے ہر اُس طرزِ عمل کی ممانعت فرمائی جو رہبانیت سے مطابقت رکھتا ہو۔ حضور اکرم ﷺ کا طرزِ عمل یہ تھا کہ آپ ؐ نے گاہے اچھے کھانے اور اچھے کپڑے بھی استعمال کیے ہیں۔ فدک اور خیبر کے ذکر میں محدثین اور اربابِ سیر لکھتے ہیں کہ آپ ؐ ان کی آمدنی سے سال بھر کا خرچ لے لیا کرتے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ آپ ؐ کا میلانِ طبع زخارفِ دُنیوی سے اجتناب تھا۔ فرمایا کرتے ''فرزند آدم کو ان چند چیزوں کے سوا اور کسی چیز کا حق نہیں: رہنے کے لیے گھر' ستر پوشی کے لیے ایک کپڑا اور شکم سیری کے لیے روکھی سوکھی روٹی اور پانی''۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: وَلَا يُطْوٰى لَهٗ ثَوْبٌ ''کبھی آپ ؐ کا کوئی کپڑا تہہ کر کے نہیں رکھا گیا''۔ یعنی صرف ایک جوڑا کپڑا ہوتا تھا' دوسرا نہیں ہوتا تھا جو تہہ کر کے رکھا جا سکتا۔ (سیرت النبی ؐ' جلد دوم)

دراصل دنیا کی زندگی عارضی بھی ہے اور ناپائیدار بھی' مستقل زندگی جسے ثبات و دوام حاصل ہے' وہ آخرت کی زندگی ہے۔ اس زندگی کا تصور اگر ایقان کی دولت سے معمور ہو تو اس عالم رنگ و بو کی رعنائیاں انسان کو اپنے اندر جذب نہیں ہونے دیتیں' وہ ربّ قدیر کی قدرت کے عجائب و کمالات کو بہ نظر غائر دیکھتا ہے' اس کی بے حد و حساب نعمتوں سے استفادہ کرتا ہے

*

اوراس کی بارگاہ میں تشکر وامتنان کے جذبوں کا قول وعمل سے نذرانہ بھی پیش کرتا ہے۔قرآن حکیم کے ان ارشادات کو کہ:﴿وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ﴾ (العنکبوت:٦٤) ''اور یہ دنیا کی زندگی دل لگی اور کھیل کود کے سوا کچھ نہیں۔'' اور ﴿وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ﴿٢٠﴾﴾ (الحدید) ''اور دنیا کی زندگی دھوکے کی ٹٹی کے سوا کچھ نہیں۔'' دُنیوی زندگی کی ناپائیداری اور بے ثباتی کے تناظر میں دیکھتا ہے اوراس چندروزہ زندگی کو کڑا امتحان سمجھتا ہے۔ اسے یہ بات بخوبی از بر ہوتی ہے کہ اس کی تخلیق ایک ارفع مقصد کی رہین منت ہے اور وہ مقصد یہ ہے کہ وہ اللہ کی پرستش بھی کرے اور اطاعت بھی' اور شیطان کے بچھائے ہوئے دامِ تزویر میں پھنسنے نہ پائے' بلکہ ہر گھڑی چوکنا رہے۔ وہ اپنی پوری زندگی انفرادی سے لے کر اجتماعی تک احکامِ الٰہی کے تحت گزارے۔اس کی دُنیوی زندگی کے نظام کی تمام تر ہیئت وشکل وہی ہو جواُس کے مالک کو پسند ہے۔ وہ نہ صرف اللہ کے ذکر وفکر میں مشغول رہے بلکہ زندگی کے میدان میں اُتر کر ایک صالح معاشرے کی تشکیل وتزئین میں اپنا سرگرم کردار ادا کرے اور یوں اطاعت گزار رعیت ہونے کا ثبوت فراہم کرے۔ظاہر ہے کہ گوشہ گیری اور نفس کشی کے طریقے اس اجتماعی نظام سے ہم آہنگ نہیں ہو سکتے۔

اللہ تعالیٰ نے رسول اکرمﷺ کو اعلیٰ درجہ کی طبعی اور خلقی موزونیت کے شرف سے مشرف فرمایا تھا' آپؐ کی زندگی میں افراط وتفریط کا کوئی گزر نہ تھا' نفس کے جائز حقوق کی پاسداری بدرجۂ اَتم موجود تھی۔ آپؐ کے ہاں نہ تو تکلفات تھے اور نہ زہد وتقشّف کا غیر ضروری غلبہ تھا۔ بقول شاعر: ؎

یہاں تو عشق کی تہذیب اور ہی کچھ ہے
جنوں ہے اور گریباں کسی کا چاک نہیں

حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ حضور نبی کریمﷺ نے فرمایا:

((اِنَّ الدِّيْنَ يُسْرٌ ' وَلَنْ يُشَادَّ الدِّيْنَ اَحَدٌ اِلَّا غَلَبَهٗ ' فَسَدِّدُوْا وَقَارِبُوْا وَاَبْشِرُوْا وَاسْتَعِيْنُوْا بِالْغَدْوَةِ وَالرَّوْحَةِ وَشَيْءٍ مِنَ الدُّلْجَةِ))

(صحیح البخاری' کتاب الایمان)

''یقیناً دین آسان ہے' اور جو بھی دین سے زور آزمائی کرے گا دین اس پر غالب آجائے گا۔اس لیے میانہ روی اور اعتدال کے ساتھ چلو۔ قریب کے پہلوؤں کی

رعایت کرو اور انبساط رکھو اور صبح وشام اور کسی قدر تاریکیٔ شب کی عبادت سے تقویت حاصل کرو''۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین بار فرمایا:

((هَلَكَ الْمُتَنَطِّعُوْنَ))(صحیح مسلم' کتاب العلم)

''مبالغہ اور سختی سے کام لینے والے ہلاک ہوئے''۔

مشہور صحابی حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی يُحِبُّ اَنْ يَرٰى اَثَرَ نِعْمَتِهٖ عَلٰى عَبْدِهٖ)) (سنن الترمذی)

''اللہ تعالیٰ اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اپنی نعمت کا نشان بندے پر دیکھے''۔

یہ تھا محسن کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے زہد اور قناعت کا نقطۂ کمال جس کی پیروی میں ہماری نجات ہے۔ بقول شاعر ؎

متاعِ قلبِ مؤمن ہے نبیؐ کا اسوۂ کامل
اسی میں شانِ استغنا اسی میں جاہ وحشمت ہے

اخذ واستفادہ

- ☆ تفہیم القرآن' جلد پنجم' از سید مودودیؒ
- ☆ مفردات القرآن' امام راغب اصفہانی
- ☆ ریاض الصالحین' امام نوویؒ
- ☆ سیرت النبیؐ' جلد دوم' سید سلیمان ندویؒ
- ☆ نبی رحمتؐ' مولانا ابوالحسن علی ندوی
- ☆ اسلامی تصوف' سید احمد عروج قادری
- ☆ اسلام ایک نظر میں' مولانا صدر الدین اصلاحی
- ☆ رحمۃ للعالمین' قاضی محمد سلیمان منصور پوری

*

1

انسانی مسئولیت کی بنیادی اساسات

رحمت اللہ بٹر

﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰي كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ۝۷۰﴾ (الاسراء)

''بے شک ہم نے آدم کی اولاد کو بہت عزت دی اور ان کے لیے سواری کا بندوبست کیا خشکی اور تری میں اور ان کے لیے پاکیزہ چیزوں سے رزق مہیا کیا اور ان کو واقعی فضیلت دی اپنی کثیر مخلوق پر۔''

انسان کا یہی اکرام اور فضیلت اصل میں اس کی مسئولیت کی بنیادیں ہیں۔

(۱) سب سے پہلی فضیلت تو روحِ انسانی ہے جو سب سے پہلی تخلیق اور عالمِ امر کی چیز ہے۔ پھر اس روحِ انسانی کو' جو فطرتِ انسانی کہلاتی ہے' اللہ تعالیٰ نے اپنی ہدایت کے شعور سے نوازا تاکہ وہ اس پر رہ کر زندگی گزارے' جیسے فرمایا:

﴿وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۭ قَالُوْا بَلٰي ۚ شَهِدْنَا ۚ اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ ۝۱۷۲ اَوْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اَشْرَكَ اٰبَاۗؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا ذُرِّيَّةً مِّنْۢ بَعْدِهِمْ ۚ اَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُوْنَ ۝۱۷۳﴾ (الاعراف)

''(وہ وقت یاد کرو) جب تمہارے ربّ نے بنی آدم کی پشتوں سے اُن کی نسلوں کو نکالا تھا اور ان کو خود اپنے اوپر گواہ ٹھہراتے ہوئے پوچھا تھا کہ کیا میں تمہارا ربّ نہیں ہوں؟ تمام انسانوں نے جواب دیا: کیوں نہیں' ہم اس پر گواہ ہیں۔ (ہم نے یہ عہد اُس سے اس لیے لیا) تاکہ تم قیامت کے دن یہ نہ کہہ دو کہ ہم تو اس بات سے بے خبر تھے (کہ ہمارا ربّ کون ہے) یا تم (اُس دن) یہ نہ کہہ دو کہ شرک تو اس سے پہلے ہمارے آباء واَجداد نے اختیار کیا تھا اور ہم تو اُن کے بعد ان کی اولاد تھے (ہم نے

انہیں شرک کرتے ہوئے پایا تو ہم بھی مشرک ہوگئے)۔تو کیا ان باطل کرنے والوں کی وجہ سے تو ہمیں ہلاکت میں ڈالتا ہے؟''

یہ ہے وہ عہد جو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن نسل انسان کو جتلائیں گے۔

سورۃ یٰسٓ میں روزِ محشر انسان کی مسئولیت کا نقشہ اس طرح کھینچا گیا ہے:

﴿وَامۡتَازُوا الۡیَوۡمَ اَیُّهَا الۡمُجۡرِمُوۡنَ ﴿۵۹﴾ اَلَمۡ اَعۡهَدۡ اِلَیۡكُمۡ یٰبَنِیۡۤ اٰدَمَ اَنۡ لَّا تَعۡبُدُوا الشَّیۡطٰنَ ۚ اِنَّهٗ لَكُمۡ عَدُوٌّ مُّبِیۡنٌ ﴿۶۰﴾ وَّاَنِ اعۡبُدُوۡنِیۡ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسۡتَقِیۡمٌ ﴿۶۱﴾﴾ (یٰسٓ)

''اے جرم (سرکشی) کرنے والو! آج کے دن ذرا تم علیحدہ ہو جاؤ۔ اے آدم کی اولاد! کیا میں نے تم سے عہد نہیں لیا تھا کہ تم شیطان کی بندگی نہیں کرو گے؟ یقیناً وہ تو تمہارا کھلا دشمن تھا۔ اور یہ کہ تم میری ہی بندگی کرو گے۔ یہی تھا سیدھا راستہ (جو تمہیں اختیار کرنا چاہیے تھا)۔''

اس عہد کے بارے میں سورۃ الروم میں فرمایا گیا ہے:

﴿فَاَقِمۡ وَجۡهَكَ لِلدِّیۡنِ حَنِیۡفًا ؕ فِطۡرَتَ اللّٰهِ الَّتِیۡ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیۡهَا ؕ لَا تَبۡدِیۡلَ لِخَلۡقِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ الدِّیۡنُ الۡقَیِّمُ ٭ۙ وَلٰكِنَّ اَكۡثَرَ النَّاسِ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۳۰﴾ مُنِیۡبِیۡنَ اِلَیۡهِ وَاتَّقُوۡهُ وَاَقِیۡمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوۡنُوۡا مِنَ الۡمُشۡرِكِیۡنَ ﴿۳۱﴾ مِنَ الَّذِیۡنَ فَرَّقُوۡا دِیۡنَهُمۡ وَكَانُوۡا شِیَعًا ؕ كُلُّ حِزۡبٍۭ بِمَا لَدَیۡهِمۡ فَرِحُوۡنَ ﴿۳۲﴾﴾

''پس (اے ہمارے رسول ﷺ!) اپنے رُخ کو یکسو رکھو اس اطاعت پر جو فطرتِ انسانی ہے، جس پر اللہ نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اس تخلیق میں تبدیلی نہیں ہوتی۔ یہی محکم اطاعت ہے، لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔ (اے مسلمانو!) تم سب اس کی طرف رُخ کر لو اور اس کی نافرمانی سے بچو اور نماز کو قائم رکھو اور مشرکوں میں سے نہ ہو جاؤ، جنہوں نے اپنی اطاعت کو بانٹ لیا اور گروہ گروہ ہو گئے! ہر گروہ جو اس کے پاس ہے اس پر اترا رہا ہے۔''

یہی حقیقت ہے جس کو نبی اکرم ﷺ نے یوں واضح فرمایا ہے:

((مَا مِنۡ مَوۡلُوۡدٍ اِلَّا یُوۡلَدُ عَلَی الۡفِطۡرَةِ، فَاَبَوَاهُ یُهَوِّدَانِهٖ اَوۡ یُنَصِّرَانِهٖ اَوۡ یُمَجِّسَانِهٖ)) (متفق علیه) وَفِیۡ رِوَایَةٍ ((یُشَرِّکَانِهٖ)) (رواه احمد)

*

''ہر بچہ فطرت پر ہی پیدا ہوتا ہے' پھر اس کے والدین اسے یہودی یا نصرانی یا مجوسی یا مشرک بنا دیتے ہیں''۔ (یعنی اس کا ربّ بدل دیتے ہیں۔)

اس عہد ہی کا نتیجہ ہے کہ ہر انسان کسی اَن دیکھی طاقت کو اپنا حاجت روا اور مشکل کشا ماننے پر مجبور ہے اور پھر اس کی اطاعت گزاری کو اپنی زندگی کا مقصود قرار دیتا ہے۔

یہی وہ فطرت ہے جس کا ظہور اُن حضرات میں ہوا جو مکہ مکرمہ میں رہتے ہوئے شرک سے بری تھے اور اللہ ہی کو اپنا ربّ مانتے تھے۔ جیسے حضرات ابوبکر صدیق' حضرت عثمان غنی' حضرت زید رضی اللہ عنہم وغیرہ۔ مؤخر الذکر کے بارے میں آتا ہے کہ کعبہ کے پردے پکڑ کر پکارا کرتے تھے کہ اے اللہ! تو ہی میرا ربّ ہے اور میں تیرا ہی پجاری ہوں' لیکن مجھے معلوم نہیں کہ تیری پوجا کیسے کروں اور تیری اطاعت گزاری کیسے کروں۔

(۲) دوسری صلاحیت جو انسان کو عطا کی گئی' اس کا ذکر سورۃ البقرۃ کے چوتھے رکوع میں ہے۔ جب فرشتوں نے حضرت آدم علیہ السلام کے بارے میں اپنے خدشات کا ذکر کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان سے فرمایا:

﴿ اِنِّیۡۤ اَعۡلَمُ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۳۰﴾ ﴾

''میں خوب جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے''۔

اور پھر آدم علیہ السلام کو زمین کی ساری اشیاء اور ان کے خواص کا علم عطا کیا اور اس کو خلافتِ ارضی کا جواز قرار دیا۔ یہ وہ صلاحیت ہے جس کی بنیاد پر انسان کو جو نعمتیں حاصل ہیں اسے ان کے عطا کرنے والے کا ممنونِ احسان ہونا چاہیے نہ کہ ظلوم و جہول۔ اور اس شکر کی صورت یہ ہونی چاہیے کہ وہ اپنے اختیار اور ارادے سے وہ فرائض و احکام بجا لائے جو اسے اس ہستی نے سونپے ہیں جس نے اسے خلافت ارضی سے سرفراز فرمایا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم ان لوگوں کو جو اُسے مان کر ان نعمتوں کا حق ادا کرتے ہیں' لازماً خلافت ارضی عطا کرتے ہیں اور ان کے نظامِ اطاعت کو زمین پر رائج کرتے ہیں اور انہیں امن و امان کی کیفیت عطا کرتے ہیں' تاکہ تمام انسان اپنے ذاتی فرائض ادا کرنے کے قابل ہو جائیں۔

(۳) تیسری صلاحیت جو انسان کو عطا ہوئی ہے' وہ سمع و بصر اور قلب وفؤاد ہے۔ انسان کو قدرت نے یہ بہت بڑی صلاحیتیں ودیعت کی ہیں کہ انسان ان کے ذریعے اپنا حقِ امانت بھی

ادا کر سکتا ہے اور انہی کے ذریعے اس کو خلافت ارضی کا حق ادا کرنے کے قابل بنایا گیا ہے۔فرمایا:

﴿هُوَ الَّذِیْۤ اَنْشَاَكُمْ وَ جَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ الْاَفْـِٕدَةَؕ قَلِیْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ۝۲۳﴾ (المُلك)

''وہ ہے اللہ جس نے تمہیں پیدا کیا اور تمہیں کان' آنکھ اور دماغ عطا کیا۔ بہت تھوڑا ہے جو تم شکر ادا کرتے ہو۔''

چنانچہ قرآن مجید میں بار بار انسان کو یاد دلایا گیا ہے کہ ان صلاحیتوں سے صرف حیوانی کام نہ لو بلکہ انسانی حق ادا کرو۔فرمایا:

﴿اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ۝۱۹۰﴾ (آل عمران)

''بے شک زمین و آسمان کی پیدائش اور دن اور رات کے الٹ پھیر میں نشانیاں ہیں عقل والوں کے لیے۔''

ان نعمتوں کا تقاضا ہے کہ انسان دنیا میں جو راستہ بھی اختیار کرے وہ دلیل کی بنیاد پر اختیار کرے اور زندگی میں بھیڑ چال نہ چلے۔آباء پرستی کا چلن تو وہ اختیار کرتے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے یہ صلاحیتیں نہیں دیں۔فرمایا:

﴿وَ لَا تَقْفُ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌؕ اِنَّ السَّمْعَ وَ الْبَصَرَ وَ الْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓىِٕكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔوْلًا۝۳۶﴾ (بنی اسراءیل)

''اور ایسا موقف مت اختیار کرو جس کے لیے تمہارے پاس علم نہیں ہے' بے شک کان' آنکھ اور دماغ سب کے بارے میں سوال ہوگا۔''

اور فرمایا:

﴿اَفَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَ اَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّ خَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَ قَلْبِهٖ وَ جَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةًؕ فَمَنْ یَّهْدِیْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ۝۲۳﴾ (الجاثیة)

''کیا آپ نے اُس انسان کی حالت پر غور کیا جس نے اپنی خواہشِ نفس کو اپنا الٰہ بنایا ہوا ہے؟ اور اللہ تعالیٰ نے گمراہ کر دیا ہے اس کو علم ہونے کے باوجود' اور اس کے کان

*

3

اور دل پر مہر کر دی ہے اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہے۔ پس اسے کون ہدایت دے گا اللہ کے بعد؟ تو (اے لوگو!) کیا تم یاد دہانی حاصل نہیں کرتے؟"

اور ان صلاحیتوں سے کام نہ لینے کی پاداش میں اللہ تعالیٰ انسانوں اور جنوں کی ایک کثیر تعداد کو جہنم کے حوالے کر دیں گے' جیسے فرمایا:

﴿وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۖ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ۭ اُولٰۗىِٕكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ١٧٩﴾ (الاعراف)

"یہ ایک حقیقت ہے کہ ہم نے جنوں اور انسانوں کی ایک کثیر تعداد جہنم ہی کے لیے پیدا کی ہے۔ ان کے دل تو ہیں مگر ان سے سوچتے سمجھتے نہیں' ان کی آنکھیں ہیں' مگر وہ ان سے دیکھتے نہیں' ان کے کان ہیں مگر ان سے سنتے نہیں۔ یہ ہیں جو چوپایوں جیسے ہیں' بلکہ ان سے بھی زیادہ بے سمجھ' یہی اصل میں غافل ہیں۔"

ان صلاحیتوں کا اصل مصرف تو یہ تھا کہ ان سے کام لے کر وہ اللہ کے پیغام کو سنتے اور پڑھتے اور آسمانی ہدایت قبول کرتے' لیکن انہوں نے حیوانی سطح پر ہی زندگی گزاری' صرف اللہ کی نعمتوں سے لطف اندوز ہوتے رہے' چوپایوں کی طرح کھانے پینے اور نفسانی خواہشات کی تکمیل میں وقت گزارتے رہے اور اپنے مقام کے بارے میں کبھی نہ سوچا۔ فرمایا:

﴿اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ يَّعْقِلُوْنَ بِهَآ اَوْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا ۚ فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ ٤٦﴾ (الحج)

"کیا یہ لوگ کبھی زمین کی سیر پر نہیں نکلے' پھر ان کے لیے دل ہوتے جن سے سوچتے یا ان کے کان ہوتے جن سے (نصیحت کی بات) سنتے؟ حقیقت یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں' بلکہ وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہیں"۔

اور فرمایا:

﴿وَعَرَضْنَا جَهَنَّمَ يَوْمَىِٕذٍ لِّلْكٰفِرِيْنَ عَرْضَا ١٠٠ الَّذِيْنَ كَانَتْ اَعْيُنُهُمْ فِيْ غِطَاۗءٍ عَنْ ذِكْرِيْ وَكَانُوْا لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَمْعًا ١٠١﴾ (الکہف)

"ہم قیامت کے دن ان ناشکروں کے سامنے جہنم لے آئیں گے جیسے لائی جاتی ہے۔

یہ وہ تھے جن کی آنکھیں بند رہیں ہمارے ذکر (آسمانی ہدایت) سے اور ان کو سننے کی بھی فرصت نہ ملی۔''

اور اسی طرح فرمایا:

﴿وَمَنۡ اَعۡرَضَ عَنۡ ذِکۡرِیۡ فَاِنَّ لَہٗ مَعِیۡشَۃً ضَنۡکًا وَّنَحۡشُرُہٗ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ اَعۡمٰی ﴿۱۲۴﴾ قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرۡتَنِیۡۤ اَعۡمٰی وَقَدۡ کُنۡتُ بَصِیۡرًا ﴿۱۲۵﴾ قَالَ کَذٰلِکَ اَتَتۡکَ اٰیٰتُنَا فَنَسِیۡتَہَا ۚ وَکَذٰلِکَ الۡیَوۡمَ تُنۡسٰی ﴿۱۲۶﴾ وَکَذٰلِکَ نَجۡزِیۡ مَنۡ اَسۡرَفَ وَلَمۡ یُؤۡمِنۡۢ بِاٰیٰتِ رَبِّہٖ ؕ وَلَعَذَابُ الۡاٰخِرَۃِ اَشَدُّ وَاَبۡقٰی ﴿۱۲۷﴾ اَفَلَمۡ یَہۡدِ لَہُمۡ کَمۡ اَہۡلَکۡنَا قَبۡلَہُمۡ مِّنَ الۡقُرُوۡنِ یَمۡشُوۡنَ فِیۡ مَسٰکِنِہِمۡ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی النُّہٰی ﴿۱۲۸﴾﴾ (طٰہٰ)

''جو رُخ پھیرے گا ہماری یاددہانی (ہدایتِ ربانی) سے تو اس کی زندگی کی گزران تنگ ہوگی اور قیامت کے دن ہم اسے اندھا کر کے اٹھائیں گے۔ وہ کہے گا پروردگار! مجھے تو نے اندھا کیوں اٹھایا جبکہ میں تو آنکھوں والا تھا؟ اللہ فرمائے گا اس لیے کہ تمہارے پاس ہماری آیات پہنچ گئی تھیں تو تو نے انہیں بھلا دیا تھا (تو نے آنکھیں بند رکھیں اور ان کی طرف توجہ نہ کی)۔ اور اسی طرح آج تو بھلا دیا گیا ہے (ہم نے تیری بینائی سلب کر لی ہے) اور ہم اسی طرح بدلہ دیتے ہیں اس کو جو حد سے بڑھے اور ایمان نہ لائے اپنے ربّ کی آیات (نشانیوں) پر۔ اور یقیناً آخرت کا عذاب سب سے سخت اور ہمیشہ باقی رہنے والا ہے۔ کیا یہ ان کی رہنمائی کے لیے کافی نہیں کہ کتنی جماعتیں ہم نے ان سے پہلے ہلاک کیں جن کے مسکنوں پر ان کا گزر ہوتا ہے۔ بے شک اس میں نشانیاں ہیں عقل مندوں کے لیے۔''

(۴) چوتھی صلاحیت جو اللہ تعالیٰ نے انسان کو عطا کی ہے' وہ نیکی اور برائی کی تمیز ہے جو اس کی فطرت میں سمو دی گئی ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿وَنَفۡسٍ وَّمَا سَوّٰىہَا ﴿۷﴾ فَاَلۡہَمَہَا فُجُوۡرَہَا وَتَقۡوٰىہَا ﴿۸﴾ قَدۡ اَفۡلَحَ مَنۡ زَکّٰىہَا ﴿۹﴾ وَقَدۡ خَابَ مَنۡ دَسّٰىہَا ﴿۱۰﴾﴾ (الشمس)

''اور نفس انسانی کی قسم اور جیسا کچھ اس کو سنوارا۔ پھر (اللہ تعالیٰ نے) وحی کر دی اس میں اس کی بدکرداری اور اس کی پرہیزگاری۔ بے شک مراد کو پہنچ گیا جس نے اس کو

*

سنوار لیا اور نامراد ہو گیا جس نے اسے (فسق وفجور سے) دبا دیا۔‘‘

حضرت وابصہ بن معبد رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا کہ میں نیکی اور گناہ کے بارے میں سب کچھ رسول اللہ ﷺ سے دریافت کرلوں۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ فرمائیں! آپ ﷺ نے فرمایا:

((جِئْتَ تَسْاَلُنِیْ عَنِ الْبِرِّ وَالْاِثْمِ؟)) قُلْتُ: نَعَمْ! فَجَمَعَ اَصَابِعَهُ الثَّلَاثَ فَجَعَلَ یَنْکُتُ بِهَا فِیْ صَدْرِیْ وَیَقُوْلُ: ((یَا وَابِصَةُ اسْتَفْتِ نَفْسَکَ' اَلْبِرُّ مَا اطْمَاَنَّ اِلَیْهِ الْقَلْبُ وَاطْمَاَنَّتْ اِلَیْهِ النَّفْسُ' وَالْاِثْمُ مَا حَاکَ فِیْ الْقَلْبِ وَتَرَدَّدَ فِی الصَّدْرِ وَاِنْ اَفْتَاکَ النَّاسُ)) (مسند احمد)

’’تو نیکی اور برائی کے بارے میں پوچھنا چاہتا ہے‘‘؟ میں نے عرض کیا' ہاں! تو آپؐ نے اپنی تین انگلیوں کو اکٹھا کر کے ان سے میرے سینے پر مارنا شروع کیا اور فرمایا: ’’اے وابصہ! اپنے نفس سے پوچھ لیا کرو' نیکی وہ ہے جس پر دل اور نفس میں اطمینان اور تسکین پیدا ہو اور گناہ وہ ہے جو دل میں خلش پیدا کرے اور سینے میں خلجان' اگرچہ لوگ تجھے اس کے جواز کا فتویٰ دے دیں‘‘۔

حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ وَّ اِنَّکُمْ تَخْتَصِمُوْنَ اِلَیَّ وَلَعَلَّ بَعْضَکُمْ اَنْ یَّکُوْنَ اَلْحَنَ بِحُجَّتِهٖ مِنْ بَعْضٍ وَاَقْضِیَ لَهٗ عَلٰی نَحْوِ مَا اَسْمَعُ فَمَنْ قَضَیْتُ لَهٗ مِنْ حَقِّ اَخِیْهِ شَیْئًا فَلَا یَاْخُذْ فَاِنَّمَا اَقْطَعُ لَهٗ قِطْعَةً مِّنَ النَّارِ))

(صحیح البخاری' کتاب الحیل۔ وصحیح مسلم' کتاب الاقضیة)

’’یقیناً میں ایک انسان ہوں اور لوگو تم اپنے جھگڑے میرے پاس لے کر آتے ہو۔ اور ہو سکتا ہے تم سے کوئی دوسرے سے دلیل میں زیادہ ماہر ہو اور میں اس سے دلائل سن کر اس کے حق میں فیصلہ کردوں اس کے بھائی کے حق سے (اور وہ جانتا ہو' یعنی اس کا نفس گواہی دے کہ یہ اس کا حق نہیں ہے) تو وہ اپنے بھائی سے وہ چیز نہ لے' کیونکہ ایسی صورت میں وہ آگ کا انگارہ اپنے حق میں مجھ سے لے کر جائے گا۔‘‘

اس کے برعکس نفسِ انسانی میں اللہ تعالیٰ نے کچھ جبلی تقاضے رکھے ہیں' جن کا ذکر قرآن مجید میں یوں ہے:

﴿زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ط ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ج وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ﴿١٤﴾﴾ (آل عمران)

''مزین کردی گئی ہیں انسانوں کے لیے نفس کی پسندیدہ چیزیں یعنی عورتیں' بیٹے' سونے اور چاندی کے ڈھیر' نشان زدہ گھوڑے' مویشی اور کھیتی۔ یہ اصل میں دنیاوی زندگی کی برتنے کی چیزیں ہیں۔ اور اللہ ہی ہے جس کے پاس بہترین ٹھکانہ ہے۔''

یہ لوازماتِ انسانی ہیں:

(۱) شہوانی خواہشات و داعیاتِ نفسانی

(۲) اولاد اور خونی قرابتوں کی محبت

(۳) مال و زر کی محبت

(۴) جاہ و منصب کی چاہت

پس اوپر ذکر کی گئی فطری صلاحیتوں اور ان نفسانی تقاضوں میں کشمکش برپا ہے جس سے انسان گزرتا ہے۔ اگر وہ فطری صلاحیتوں کو پروان چڑھاتا ہے اور ان کی نشوونما اور تربیت کا بندوبست کرتا ہے تو ﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا﴾ کی کیفیت بن جاتی ہے اور اگر جبلی تقاضوں کا غلام ہو کر حُبّ عاجلہ میں پڑ جاتا ہے تو ﴿قَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا﴾ سے واسطہ پڑے گا۔ یہی حقیقت ہے جسے قرآن مجید میں یوں بھی بیان کیا گیا ہے:

﴿وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ ﴿١﴾ وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ ﴿٢﴾ وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ ﴿٣﴾ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ﴿٤﴾ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ﴿٥﴾﴾ (التّین)

''قسم ہے انجیر اور زیتون کی' اور طورِ سینین کی' اور اس امن والے شہر (مکہ مکرمہ) کی۔ تحقیق ہم نے انسان کو خوبصورت ساخت پر پیدا کیا۔ پھر ہم نے اسے الٹا پھیر کر سب نیچوں سے نیچا کر دیا۔''

یہ دراصل وہ چار جگہیں ہیں جہاں چار اولوا العزم رسول علیہم السلام مبعوث ہوئے جن کی زندگیوں کی گواہی دی جا رہی ہے کہ انسان کو واقعی بہترین ساخت پر پیدا کیا گیا ہے۔ پھر اسے امتحان کے لیے ہم نے نچلوں میں سے نچلوں میں بنا دیا' یعنی انسانی خواہشات دے کر زمین پر بھیج دیا۔ پھر جب وہ فطرت کو چھوڑ کر خواہشات کا قیدی ہو جاتا ہے تو نچلوں میں سے نچلا

*

5

ہو جاتا ہے۔

اور نتیجہ کے لحاظ سے کتنا واضح فرق ہے، جیسے فرمایا:

﴿فَاَمَّا مَنْ طَغٰی﴿۳۷﴾ وَاٰثَرَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا﴿۳۸﴾ فَاِنَّ الْجَحِیْمَ هِیَ الْمَاْوٰی﴿۳۹﴾ وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَی النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰی﴿۴۰﴾ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِیَ الْمَاْوٰی﴿۴۱﴾﴾ (النّٰزعٰت)

''پھر جس نے (اس دنیا میں ان فطری صلاحیتوں کے ہوتے ہوئے نفسانی داعیات کی سیرابی کے لیے) سرکشی اختیار کی، اور دنیا کی زندگی کو ترجیح دے لی، پس اس کا ٹھکانہ جہنم ہو گا۔ اور جو ڈر گیا اپنے ربّ کے سامنے جوابدہی سے اور اپنے نفس کو (اس کی) خواہشات سے روکے رکھا، پس اس کا ٹھکانہ جنت ہو جائے گا''۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں ان فطری صلاحیتوں سے کام لے کر اور نفسانی داعیات پر قابو پا کر اور واقعی اللہ کا بندہ بن کر زندگی گزارنے کی توفیق عطا فرمائے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس دنیا کو مؤمن کے لیے قید خانہ اور کافر کے لیے جنت قرار دیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا: ((اَلدُّنْیَا سِجْنُ الْمُؤْمِنِ وَجَنَّةُ الْکَافِرِ)) (صحیح مسلم، کتاب الزھد والرقائق) ''یہ دنیا مؤمن کے لیے قید خانہ ہے اور کافر کے لیے جنت ہے''۔ مؤمن آدمی کو چاہیے کہ وہ ایسی پابندی کی زندگی گزارے جیسے کہ قیدی گزارتا ہے، کیونکہ اُس نے اللہ کو اپنا مالک تسلیم کیا ہے، جس کا تقاضا ہے کہ اس کے احکام کی پابندی کرے اور کافر کی طرح من چاہی زندگی گزارنے سے بچے۔ کیونکہ وہ کسی کو اپنا مالک تسلیم نہیں کرتا، اس لیے من چاہی زندگی گزارتا ہے اور اپنے نفس کی چاہتوں کے حصول کے لیے ہی زندگی گزارتا ہے۔ جنت وہ جگہ ہے جہاں من چاہی زندگی ہو گی۔ حقیقت یہی ہے کہ جس نے یہاں من چاہی زندگی گزاری اسے آخرت میں جہنم کی قید کاٹنا ہو گی اور جس نے یہاں پابندی کی زندگی اختیار کی اسے آخرت میں جنت کی من چاہی زندگی مل جائے گی۔

❁ ❁ ❁

؟؟

گستاخانِ رسول ﷺ پر قہر الٰہی

کی انتقامی تفصیلات

پروفیسر قاضی حلیم فضلی

گزشتہ دنوں ڈنمارک کے اخبارات میں توہین آمیز خاکوں کی دوبارہ اشاعت سے مسلمانانِ عالم کے جذبات ایک بار پھر شدید مجروح ہوئے ہیں اور پورے عالمِ اسلام میں اس گستاخانہ حرکت پر احتجاج کیا جا رہا ہے۔ قبل ازیں شاتمِ رسول ؐ سلمان رشدی کو برطانیہ کی طرف سے ''سر'' کا خطاب دیے جانے پر بھی مسلمان ممالک میں احتجاج' مظاہروں' جلسوں اور جلوسوں کا سلسلہ جاری رہا تھا۔ دشمنانِ اسلام اظہارِ خیال کی آزادی کے نام پر اِن دلآزار ہتھکنڈوں سے مسلم اُمّہ کے جذبات سے کھیل رہے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ان صفحات میں محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے دور میں اور اُن کے بعد آج تک گستاخانِ رسول ﷺ کو اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانِ حقیقت بیان یاد دلا دوں جو ہر دور میں پورا ہو کر رہا۔ سورۃ الحجر میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿فَاصۡدَعۡ بِمَا تُؤۡمَرُ وَاَعۡرِضۡ عَنِ الۡمُشۡرِكِيۡنَ ۞ اِنَّا كَفَيۡنٰكَ الۡمُسۡتَهۡزِءِيۡنَ ۞﴾

''پس (اے نبی!) تمہیں جس بات کا حکم دیا گیا ہے اسے انجام دیتے رہو اور مشرکین کی پرواہ نہ کرو۔ تمہاری طرف سے ہم ان مذاق اڑانے والوں (کی خبر لینے) کے لیے کافی ہیں''۔

رسول اللہ ﷺ کی دعوت کے ابتدائی دنوں میں مشرکین کی طرف سے آپ ﷺ کے ساتھ استہزاء' ٹھٹھے بازی' نقالی اور طنز و مزاح کی کمیٹیاں بنائی گئیں۔ ان کی دل آزار حرکتیں' طنزیہ فقرے' تحقیر و تذلیل کے انداز رسول اللہ ﷺ کی دلآزاری کا باعث تھے۔ اس آیت میں آنحضرت ﷺ کو تسلی دے کر ٹھٹھے بازوں سے نمٹنے کا وعدہ فرمایا گیا ہے۔ چنانچہ ان تمام ممبران کمیٹی کا انجام عبرتناک ہوا۔ جس کی تفصیل سے پہلے آپ ﷺ کے حقیقی چچا ابولہب کا ذکر

ضروری سمجھتا ہوں۔قرآن کریم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿تَبَّتۡ یَدَاۤ اَبِیۡ لَہَبٍ وَّ تَبَّ ؕ﴿۱﴾ مَاۤ اَغۡنٰی عَنۡہُ مَالُہٗ وَ مَا کَسَبَ ؕ﴿۲﴾ سَیَصۡلٰی نَارًا ذَاتَ لَہَبٍ ۚ﴿ۖ۳﴾ وَّ امۡرَاَتُہٗ ؕ حَمَّالَۃَ الۡحَطَبِ ۚ﴿۴﴾ فِیۡ جِیۡدِہَا حَبۡلٌ مِّنۡ مَّسَدٍ ٪﴿۵﴾﴾ (اللّھب)

''ابولہب کے دونوں ہاتھ ٹوٹ گئے اور وہ خود بھی ہلاک ہوا۔اُس کا مال اور جو کچھ اُس نے کمایا تھا وہ اس کے کام نہ آیا۔وہ بہت جلد شعلے مارتی ہوئی آگ میں داخل ہوگا۔اور اس کی چغل خور عورت بھی (ہلاک ہوگی) جس کے گلے میں کھجور کی چھال کا رسّہ ہوگا۔''

قرآن کریم کی مندرجہ بالا سورت کا نام سورۃ اللھب ہے اور یہ قرآن کریم کی آخری سورتوں میں سے ہے۔ یہ سورت ابتدائی مکی دور میں نازل ہوئی۔مفسرین کا خیال ہے کہ یہ سورت اُس وقت نازل ہوئی جب قریش مکہ نے رسول اکرمﷺ اور آپؐ کے خاندان کا مقاطعہ کر کے انہیں شعب ابی طالب میں محصور کر دیا تھا اور ہر قسم کے معاشی، سماجی اور معاشرتی روابط سے محروم کر کے درختوں کے پتے اور جڑیں کھانے پر مجبور کر دیا تھا۔اس موقع پر ابولہب وہ آدمی تھا جس نے اس مصیبت کی گھڑی میں اپنے خاندان اور حضورﷺ کا ساتھ دینے کی بجائے خاندانی دشمنی کا ساتھ دیا تھا، بلکہ دشمنوں سے بڑھ کر دشمنی کی تھی۔ پورے قرآن کریم میں یہی ایک مقام ہے جس میں تمام دشمنانِ اسلام میں سے صرف ابولہب کا نام لے کر اس کی برائی بیان کی گئی ہے۔اس امتیازی رسوائی اور برائی کی وجہ یہی تھی کہ عرب معاشرے میں اپنی ہزار برائیوں کے باوجود یہ اچھی روایت موجود تھی کہ وہ لوگ صلہ رحمی اور خاندانی رشتوں کا لحاظ رکھتے تھے۔قطع رحمی، دشمنی اور برائی ان رشتوں میں گناہ سمجھی جاتی تھی۔ان کے ہاں اسی روایت کا نتیجہ تھا کہ آنحضورﷺ نے جب دعوائے نبوت فرمایا تو قریش کے دوسرے خاندانوں نے دل کھول کر دشمنی کا حق ادا کر دیا، مگر بنو ہاشم اور بنو مطلب دو بھائیوں کی اولاد نے نہ صرف یہ کہ آپﷺ کی مخالفت نہیں کی بلکہ کھلم کھلا حمایت کرتے رہے، حالانکہ ان میں سے اکثریت نہ حضورﷺ پر ایمان لائی تھی اور نہ مسلمان ہوئی تھی۔

ابولہب کی دشمنی

عربوں کے اس اخلاقی اصول اور خاندانی عزت و روایت کو صرف اس خاندان کے ایک شخص ابولہب نے اسلام دشمنی میں توڑ دیا۔ یہ شخص ابولہب رسول اللہﷺ کا حقیقی چچا تھا۔

آپ ﷺ کے والد ماجد اور ابولہب ایک باپ کے بیٹے تھے۔ عرب معاشرے میں چچا سے توقع ہوتی ہے کہ بھتیجے خصوصاً یتیم کو اپنی اولاد کی طرح پیارا رکھے' مگر ابولہب نے حقیقی چچا ہوتے ہوئے بھی اخلاقی اور خاندانی روایات کو پامال کر دیا تھا۔ جب حضور ﷺ کو اپنے عزیز ترین قریبی رشتہ داروں کو اسلام کی دعوت دینے کا حکم ہوا تو آپ ﷺ نے کوہِ صفا پر چڑھ کر بلند آواز سے ایسے پکارا جیسے دشمن کے حملے سے خبردار کرنے کے لیے پکارا جاتا ہے: وَاصَبَاحَاه! ''ہائے صبح کی آفت!'' آپ ﷺ کی اس پکار پر قریش کے تمام افراد دوڑ پڑے۔ جب سب جمع ہو گئے تو آپ ﷺ نے قریش کے تمام خاندانوں کے نام پکار کر انہیں متوجہ کیا اور ان سے دریافت کیا کہ اگر میں یہ کہوں کہ کوہِ صفا کے پیچھے دشمن کا لشکر موجود ہے تو کیا تم میری تصدیق کرو گے؟ سب نے کہا کہ ہاں ہم تصدیق کریں گے' کیونکہ آپ الصادق اور الامین ہیں۔ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں آپ کو اللہ تعالیٰ کے سخت عذاب سے خبردار کرتا ہوں۔ میری دعوتِ نبوت پر لبیک کہو اور اپنے آپ کو آنے والے اس عذاب سے بچالو۔ اس پر کسی اور کے بولنے سے پہلے ابولہب بول اٹھا: تَبًّالَکَ أَلِھٰذَا جَمَعْتَنَا ''تم پر ہلاکت ہو' تم نے ہمیں اس لیے جمع کیا ہے؟'' ۔ نعوذ باللّٰہ من ذٰلك!

ازاں بعد ابولہب نے دشمنی اور مخالفت کی گھٹیا سے گھٹیا حرکتوں کا آغاز کر دیا۔ ابولہب نبی اکرم ﷺ کا ہمسایہ بھی تھا۔ آپ ﷺ نماز پڑھ رہے ہوتے تو ابولہب اور اس کے ہمسائے عقبہ بن ابی معیط آپ پر بکری کی اوجھڑی پھینکتے۔ صحن میں کھانا پک رہا ہوتا تو حضور ﷺ کے قریبی ہمسائے ہنڈیا میں غلاظت پھینک دیتے۔ ابولہب کی بیوی ابوسفیان کی بہن اُمّ جمیل کا مستقل یہ معمول تھا کہ وہ رات کو خاردار جھاڑیاں حضور ﷺ کے راستے میں بچھا دیتی تھی' آپ ﷺ صبح سویرے گھر سے نکلتے تو ان جھاڑیوں میں اُلجھ جاتے اور کانٹے پاؤں میں چبھ جاتے۔

نبوت سے پہلے رسول اللہ ﷺ کی دو صاحبزادیاں ابولہب کے دو بیٹوں عتبہ اور عتیبہ سے منسوب تھیں۔ نبوت کے بعد حضور ﷺ سے عناد کی وجہ سے اُس نے اپنے بیٹوں سے حضور ﷺ کی بچیوں کو طلاق دلا دی۔ عتبہ نے ازراہِ جہالت طلاق کے بعد کہا: ''میں وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰیo ...... ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰیo سے انکار کرتا ہوں'' اور نعوذ باللہ حضور ﷺ کے چہرۂ انور پر تھوک دیا۔ تھوک تو آپ ﷺ کے چہرے پر نہ پڑا مگر آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا:

''اے اللہ! تو اپنے کتوں میں سے کسی کو اس پر مسلط فرما دے''۔ شام کے قافلے میں یہی عتبہ شریک سفر تھا۔ ابولہب کی ہدایت کے مطابق قافلے والوں نے اس کی حفاظت کا پورا اہتمام کیا' لیکن اس کے باوجود شیر آیا اور عتبہ کو چیر پھاڑ گیا۔

رسول اللہ ﷺ کے صاحبزادے حضرت قاسمؓ کے بعد عبداللہ کا بھی انتقال ہو گیا تو ابولہب غمزدہ ہونے کی بجائے دوڑتا ہوا آیا اور سردارانِ قریش کے پاس پہنچ کر یہ خوشخبری سنائی کہ لو آج محمد بے نام و نشان ہو گیا۔ حضور ﷺ کی اس دلآزاری پر اللہ تعالیٰ نے سورۃ الکوثر نازل فرمائی: ﴿اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ ۝۳﴾ ''یقیناً آپ کے دشمن بے نام و نشان ہوں گے''۔

غرض ابولہب کی دشمنی اور حضور ﷺ کی دلآزاری حد سے متجاوز تھی۔ اہل قریش اور مشرکین مکہ نے جب رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے خاندان بنو ہاشم اور بنو مطلب کو شعب ابی طالب میں محصور کیا تو خاندان کے یہ افراد آپ ﷺ کی حمایت میں محصور تھے' اگرچہ اکثریت آپ ﷺ پر ایمان نہ لائی تھی۔ مگر ابولہب اس موقع پر بھی آپ ﷺ کا مخالف تھا۔ تاجروں کو اشیاءِ ضرورت دینے سے منع کرتا۔ آپ ﷺ اور آپؐ کا خاندان درختوں کے پتے کھانے پر مجبور ہو گئے تھے۔ سورۃ اللھب میں اللہ تعالیٰ نے آپ کے سگے چچا کے بارے میں نام لے کر اس کی گستاخی اور دشمنی کے ذکر کے بعد جو پیشین گوئی فرمائی وہ حرف بحرف درست ہوئی' حالانکہ اس سورت کے نزول کے وقت ان پیشین گوئیوں کا کوئی امکان نہ تھا۔ اُس وقت ابولہب کو عروج حاصل تھا۔ بعد ازاں اس کی ہلاکت' اس کی کمائی کے کام نہ آنے کے بعد اس کی خود بے نام و نشان و بے توقیری کی موت اور اس کی بیوی کے چھال کی رسّی سے پھانسی لگ جانے کی ایک ایک پیشین گوئی حرف بحرف پوری ہوئی اور اللہ کا وعدہ سچا ثابت ہوا کہ ہم تمہیں بے عزت و بے آبرو کرنے کی کوشش کرنے والوں کے لیے کافی ہیں. ﴿اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ ۝۹۵﴾

جنگ بدر میں جب قریش کے تمام سرداران' سرکش اور گستاخانِ نبوت مارے گئے جو ابولہب کے ساتھی تھے تو اسے اپنے ساتھی سرداروں کے انجام کا ایسا صدمہ ہوا کہ جنگ بدر کے ایک ہفتہ بعد ہی موت کے گھاٹ اتر گیا اور موت بھی ایسی عبرتناک اور رسوا کن کہ وہ طاعون میں مبتلا ہوا جس سے عرب دور بھاگتے تھے۔ نہ تو موت کے وقت کسی نے اس کی خبر گیری کی' نہ ہی کوئی موت کے بعد اس کے پاس گیا۔ رسول اللہ ﷺ کو (معاذ اللہ) نامراد کہنے والا بیوی اور

بیٹوں کے باوجود بے یارومددگار پڑا رہا' حتیٰ کہ میت کو دفنانے کی نوبت تک نہ آئی۔ اس طرح خدائی فرمان پورا ہوا: ﴿مَا اَغْنٰی عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ﴿٢﴾﴾۔ جب بدبو پھیلی تو لوگوں کے طعنوں سے مجبور ہو کر حبشیوں کے ذریعے لاش گھسیٹ کر دور پھینک دی گئی۔ بعض روایات میں ہے کہ جس کمرے میں مرا تھا اس کی چھت گرا کر ملبے میں دبا دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان پورا ہو کر رہا کہ کچھ بھی اس کے کام نہ آیا۔ اس کے دو بیٹے ہجرت سے پہلے مر گئے تھے۔ بیٹی درہ ہجرت کے بعد مدینہ آئی اور مسلمان ہوئی۔ دو بیٹے فتح مکہ کے بعد حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی سفارش پر حضور ﷺ کے ہاں آ کر مسلمان ہو گئے۔ چنانچہ جو شخص حضور ﷺ کو نامراد کہتا تھا اس کی اولاد حضور ﷺ کا دست و بازو بنی۔

ابولہب کی بیوی اُمِّ جمیل خاوند سے زیادہ رسول اکرم ﷺ کی گستاخی' بے ادبی اور دشمنی میں تیز تھی۔ سارا دن کانٹے چنتی اور حضور ﷺ کے راستوں میں بچھاتی۔ گھر میں جھاڑو دے کر سارا گند اور کوڑا حضور ﷺ کے صحن میں اُس وقت پھینکتی جب آپ ﷺ کے ہاں کھانا پک رہا ہوتا۔ یہ روز کا معمول تھا۔ چنانچہ وہ اللہ تعالیٰ کے انتقام کا نشانہ بنی' جیسا کہ آیت میں اس کے متعلق فرمانِ الٰہی ہے: ﴿وَامْرَاَتُهٗ ؕ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ﴿٤﴾ فِیْ جِیْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ﴿٥﴾﴾ ابولہب کی چغل خور بیوی کے گلے میں رسّی کا پھندا پھنس کر اسے پھانسی لگی۔ ہوا یوں کہ اس کے سر پر لکڑیوں کا گٹھا تھا۔ ستانے کے لیے گٹھا اونچی جگہ رکھا۔ جب جانے کے ارادے سے گٹھا سر پر رکھنا چاہا تو گٹھا اس کی پیٹھ پر آ گیا اور گٹھے کی رسّی اس کی گردن کا پھندا بن گئی۔ گٹھے کے وزن سے جو پیٹھ پر تھا' گلے کی رسّی کا پھندا سخت ہو کر اس کی پھانسی کا سبب بن گیا' جس سے وہ تڑپ تڑپ کر ہلاک ہو گئی اور اللہ تعالیٰ کا فرمان پیشین گوئی کی صورت میں حرف بحرف درست ہوا کہ ﴿فِیْ جِیْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ﴿٥﴾﴾ اس سورت کے واقعات میں ابولہب کا رسوا کن انجام کہ اس کا مال و متاع اس کے کچھ کام نہ آیا اور اس کی بیوی کی پھانسی جہاں قرآن کریم کے فرمانِ الٰہی ہونے کا ثبوت ہے وہاں حضور ﷺ کی حقانیت اور سچائی کا بین اور واضح ثبوت بھی ہے۔ ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ بھی پورا ہوا کہ: ﴿فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِیْنَ﴿٩٤﴾ اِنَّا كَفَیْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِیْنَ﴿٩٥﴾﴾۔ چنانچہ حضور ﷺ کی گستاخی' ٹھٹھے اور مذاق اڑانے والے ابولہب اور اس کی بیوی خود رسوائی اور ذلت سے دوچار ہوئے۔

رسول اللہ ﷺ کی دعوت کے آغاز میں آپ ﷺ کے استہزاء' ٹھٹھے بازی اور طنز و مزاح کی

خاطر کمیٹیاں بنائی گئی تھیں۔ چنانچہ اس کمیٹی کے ارکان کا انجام بھی فرمانِ الٰہی کے وعدہ کے مطابق یوں ہوا:

(۱) اسود بن عبدالطلب اس کمیٹی کا اہم رکن تھا۔ یہ حضورﷺ کی نقلیں اتارتا اور مزاحیہ روپ دھارتا تھا۔ ایک دن درخت کے نیچے سو کر اٹھا تو آنکھوں میں کانٹے چبھنے کی شدید تکلیف میں مبتلا ہوا۔ روتا اور تڑپتا واصل جہنم ہوا۔

(۲) عاص بن وائل حضورﷺ اور مسلمانوں کا مذاق اڑاتا' طنزیہ فقرے کستا۔ ایک دن گدھے پر سوار جارہا تھا کہ ٹھوکر لگی تو گدھے سے لڑھک کر قریبی غار میں منہ کے بل گرا' وہاں زہریلے بچھو نے ڈس لیا' سارا بدن سوج گیا اور اسی حالت میں مرگیا۔

(۳) حارث بن قیس بھی استہزائیہ کمیٹی کا ممبر تھا' مسخرا تھا۔ خدا کی پکڑ میں آیا تو پیٹ میں زرد پانی بھر گیا جو مُنہ کے راستے خارج ہوتا تھا' لوگ اس سے دور بھاگتے۔ وہ اسی رسوا کن مرض میں جہنم رسید ہوگیا۔

(۴) اسود بن یغوث حضورﷺ کی نقلیں اتارتا' منہ چڑاتا۔ اللہ تعالیٰ کی غیرت جوش میں آئی تو زہریلی گیس سے چہرہ جھلس گیا اور شکل ایسی کریہہ المنظر ہوئی کہ گھر والے بھی نہ پہچان سکے اور گھر میں گھسنے نہ دیا۔ گھر کے باہر بلک بلک کر مرگیا۔

ان کے علاوہ نضر بن حارث اور عاص بن منبہ اسی کمیٹی کے ارکان تھے اور انہیں بھی اسی رسوائی اور ذلت سے دوچار ہونا پڑا۔

برصغیر کی تقسیم سے پہلے لاہور کے ایک ہندو نے نبی کریمﷺ کی توہین میں کتاب لکھی تھی جس کا نام ''رنگیلا رسول'' رکھا تھا۔ توہین آمیز خاکوں کی اشاعت اور سلمان رشدی کے ''سر'' کا خطاب پانے سے جس طرح پاکستان اور اسلامی دنیا میں احتجاج اور جلسے کیے جارہے ہیں' اُس وقت عالمِ اسلام خصوصاً برصغیر میں ہندو کی اس کتاب پر مسلمان علماء اور عوام کی طرف سے شدید غم وغصہ کا اظہار ہوا تھا۔ چنانچہ حضرت عطاء اللہ شاہ بخاریؒ نے ایک بڑے جلسہ میں اس ہندو کی توہین آمیز کتاب پر غم وغصہ کا اظہار کرتے ہوئے انتہائی پرجوش تقریر فرمائی تھی۔ جلسہ میں موجود ایک ناخواندہ شخص علم الدین نے حضورﷺ کے ساتھ محبت وعقیدت کے جوش میں آکر چھرا تیز کیا اور سیدھا اسی ہندو کی دکان میں داخل ہوکر تصدیق کے بعد اس کو قتل کردیا اور خود گرفتاری دے دی۔ شہریوں' عوام اور وقت کے زعماء وعلماء یہاں تک کہ علامہ اقبال اور

قائداعظم نے علم الدین کے کیس کی حمایت کی، جبکہ مقدمہ انگریز سیشن جج کی عدالت میں تھا۔ انگریز جج نے انگریزوں کی روایتی دشمنی میں اس بات کی پرواہ کیے بغیر کہ قاتل نے یہ فعل اپنے نبیؐ کے ساتھ عقیدت ومحبت میں پُر جوش ہو کر کیا ہے، ہندو گستاخِ رسول کے قتل کو اہمیت دی۔ علم الدین اَن پڑھ تھا، اسے کہا گیا کہ تم قتل سے منحرف ہو جاؤ۔ اس نے جواب دیا کہ میرا اس گستاخ کو قتل کرنا اور اس کی سزا کے طور پر نبی ﷺ پر قربان ہو جانا میرے لیے باعث فخر وعزت ہے۔ چنانچہ جج نے اسے پھانسی کی سزا دے دی۔ آج تک لوگ اسے غازی علم الدین شہیدؒ کے نام سے پکارتے ہیں۔

کچھ عرصہ قبل ڈنمارک کے گستاخِ رسول صحافی نے حضور ﷺ کے توہین آمیز خاکے تیار کیے جو وہاں کے تمام اخبارات میں شائع ہوئے۔ دنیا بھر کے مسلمانوں نے اس پر احتجاج کیا مگر آزادیٔ صحافت کے نام پر دشمنانِ دین و پیغمبر اسلام کی گستاخی و بے ادبی کی کوئی پرواہ نہ کی گئی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے خود اپنے نبی کی گستاخی کی اس کو ایسی سزا دی کہ وہ اپنے گھر کے اندر آگ بھڑک اٹھنے سے خاندان سمیت جل کر راکھ ہوا۔ مغربی صحافت نے اس کے جہنم رسید ہونے کے واقعہ پر پردہ ڈال دیا اور یہ خاکے اخبارات میں دوبارہ شائع کر دیے۔

سلمان رشدی کے ''سر'' کے خطاب پر بھی عالم اسلام میں غم و غصے کا اظہار رہا، لیکن ملکۂ برطانیہ کی حکومت نے خطاب واپس نہیں لیا۔ ہمیں اُمید ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے پیارے نبی ﷺ کے اس گستاخ کو خود سزا دیں گے یا کوئی غازی علم الدین شہید پیدا ہو جائے گا، اِن شاء اللہ۔ اللہ تعالیٰ اپنا وعدہ پورا فرمائے گا: ﴿اِنَّا کَفَیۡنٰکَ الۡمُسۡتَہۡزِءِیۡنَ ۝﴾

*

؟؟

فریضۂ حج کا پس منظر و ثمرات

انجینئر نوید احمد☆

اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو فریضۂ حج کی ادائیگی کے لیے پکار لگانے کا حکم اِن الفاظ میں دیا :

﴿وَاَذِّنۡ فِی النَّاسِ بِالۡحَجِّ یَاۡتُوۡکَ رِجَالًا وَّعَلٰی کُلِّ ضَامِرٍ یَّاۡتِیۡنَ مِنۡ کُلِّ فَجٍّ عَمِیۡقٍ ﴿۲۷﴾﴾ (الحج)

’’اور پکارو لوگوں کو حج کے لیے‘ وہ آئیں گے پیدل بھی اور دبلی اونٹنیوں پر بھی‘ اور وہ آئیں گے دور دراز کی راہوں سے‘‘۔

فریضۂ حج کی ادائیگی کی طرف راغب کرنا اِس اعتبار سے ایک سعادت ہے کہ یہ دراصل سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی اِس پکار میں اپنی آواز ملانے کی ایک کوشش ہے۔ عام طور پر حج سے متعلق مضامین اُس وقت اخبارات و جرائد میں شائع ہوتے ہیں جب اِس فریضہ کی ادائیگی کے ایام قریب آتے ہیں۔ اِن مضامین کو پڑھ کر اگر کسی شخص کے دل میں حج کرنے کا شوق پیدا ہو تو وقت گزر چکا ہوتا ہے‘ کیونکہ حج کی روانگی کے ضوابط تو چند ماہ پہلے پورے کرنے ہوتے ہیں۔ مناسب ہے کہ ایسے وقت میں اِس فریضہ کی ادائیگی کی طرف متوجہ کیا جائے جب اِس سلسلہ میں درخواستیں دینے کا وقت ہوتا ہے تاکہ جو بھی یہ فریضہ ادا کرنا چاہے وہ متعلقہ ضوابط پورے کر سکے۔ اِسی لیے یہ مضمون فریضۂ حج کی ادائیگی کے ایام سے کافی پہلے ہدیۂ قارئین کیا جا رہا ہے۔

حج کی فرضیت

اللہ تعالیٰ نے حج کی فرضیت کا اعلان سورۂ آلِ عمران کی آیت ۹۷ میں فرمایا :

﴿وَلِلّٰهِ عَلَی النَّاسِ حِجُّ الۡبَیۡتِ مَنِ اسۡتَطَاعَ اِلَیۡهِ سَبِیۡلًا ؕ وَمَنۡ کَفَرَ فَاِنَّ

☆ اکیڈمک ڈائریکٹر‘ قرآن اکیڈمی کراچی

1

اللّٰهَ غَنِیٌّ عَنِ الۡعٰلَمِیۡنَ﴿۹۷﴾ (آل عمران)

''اور اللہ کے لیے لوگوں پر (فرض) ہے خانہ کعبہ کا حج کرنا جو کوئی بھی استطاعت رکھتا ہو اُس کی طرف راستہ (اختیار کرنے) کی' اور جس کسی نے کفر کیا (یعنی استطاعت کے باوجود حج نہیں کیا) تو بے شک اللہ تعالیٰ تمام جہان والوں سے غنی ہے۔''

خانہ کعبہ تک پہنچنے کی استطاعت سے مراد یہ ہے کہ :

(i) ایک شخص کے پاس اتنا مال ہو کہ وہ آمد و رفت' مکہ میں قیام و طعام اور دورانِ حج متعلقہ مقامات تک سفر اور قیام کے اخراجات برداشت کر سکتا ہو۔

(ii) وہ اہلِ خانہ کے لیے بھی اتنا مال چھوڑ جائے کہ وہ اُس کی غیر حاضری میں اپنی ضروریات پوری کر سکیں۔

(iii) راستے میں امن و امان ہو اور کسی جانی و مالی نقصان کا خطرہ نہ ہو۔

(iv) احناف کے نزدیک عورت کے لیے شرط ہے کہ حج کے سفر کے دوران اُس کا شوہر یا کوئی محرم رشتہ دار ساتھ ہو۔

اِس آیت میں باوجود استطاعت کے حج نہ کرنے کے عمل کو کفر قرار دیا گیا ہے۔ یہاں کفر سے مراد قانونی نہیں بلکہ حقیقی کفر ہے۔ اِس حوالے سے سنن الدارمی میں کتاب المناسک کے ذیل میں اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد نقل کیا گیا ہے:

((مَنۡ لَمۡ یَمۡنَعۡهُ عَنِ الۡحَجِّ حَاجَةٌ ظَاهِرَةٌ اَوۡ سُلۡطَانٌ جَائِرٌ اَوۡ مَرَضٌ حَابِسٌ فَمَاتَ وَلَمۡ یَحُجَّ فَلۡیَمُتۡ اِنۡ شَاءَ یَهُوۡدِیًّا وَاِنۡ شَاءَ نَصۡرَانِیًّا))

''جس کو نہ کسی صریح حاجت نے حج سے روکا ہو' نہ کسی ظالم سلطان نے' نہ کسی روکنے والے مرض نے اور پھر اُس نے حج نہ کیا ہو اور اسی حالت میں اُسے موت آ جائے تو اسے اختیار ہے خواہ یہودی بن کر مرے یا نصرانی بن کر''۔

سنن ابن ماجہ میں حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَنۡ اَرَادَ الۡحَجَّ فَلۡیَتَعَجَّلۡ فَاِنَّهٗ قَدۡ یَمۡرَضُ الۡمَرِیۡضُ وَتَضِلُّ الضَّالَّةُ وَتَعۡرِضُ الۡحَاجَةُ))

''جو شخص حج کا ارادہ کرے اسے جلدی کرنا چاہیے' کیونکہ کبھی آدمی بیمار ہو جاتا ہے' سواری کا بندوبست نہیں ہو سکتا یا کوئی اور رکاوٹ پیش آ جاتی ہے''۔

*

عبادتِ حج کا پس منظر

حج کی عبادت کے مرکز یعنی خانہ کعبہ کی سب سے پہلے تعمیر حضرت آدم علیہ السلام نے کی تھی۔ارشادِ نبوی ﷺ ہے :

((بَعَثَ اللّٰهُ جِبْرِيْلَ اِلٰى آدَمَ وَ حَوَّاءَ فَاَمَرَهُمَا بِبِنَاءِ الْكَعْبَةِ، فَبَنَاهُ آدَمُ، ثُمَّ اَمَرَ بِالطَّوَافِ بِهٖ وَ قِيْلَ لَهٗ اَنْتَ اَوَّلُ النَّاسِ وَ هٰذَا اَوَّلُ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ)) (رواہ البیہقی)

''اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کو حضرت آدم و بی بی حوا علیہما السلام کی طرف بھیجا اور اُن کو بیت اللہ کی تعمیر کا حکم دیا۔پس حضرت آدمؑ نے اُسے تعمیر کیا۔پھر اللہ نے اُنہیں طواف کرنے حکم دیا اور اُن سے کہا گیا کہ آپ پہلے انسان ہیں اور یہ پہلا گھر ہے جو کہ لوگوں کی عبادت کے لیے بنایا گیا ہے''۔

حوادثِ زمانہ کی وجہ سے خانہ کعبہ کی تعمیر منہدم ہوگئی اور اِسے سابقہ بنیادوں پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ساتھ مل کر دوبارہ تعمیر کیا۔ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ﴾ (البقرة: ۱۲۷)

''اور یاد کرو جب اٹھا رہے تھے ابراہیمؑ بنیادیں اللہ کے گھر کی اور اُن کے ساتھ اسماعیلؑ''۔

خانہ کعبہ کی تعمیر کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا گیا کہ وہ لوگوں کو حج کی ادائیگی کے لیے پکاریں۔حضرت ابراہیمؑ نے توحید کے اِس مرکز کی تعمیر اور اِس میں حج کی عبادت کے آغاز سے قبل شرک اور جہالت کے کن حالات و مسائل کا سامنا کیا' اِس کی تفصیل سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے اپنی تصنیف ''خطبات'' میں بڑے مؤثر الفاظ میں بیان فرمائی ہے :

بدترین مشرکانہ ماحول

''اُس وقت ساری دنیا خدا کو بھولی ہوئی تھی۔روئے زمین پر کوئی ایسا انسان نہ تھا جو اپنے اصلی مالک کو پہچانتا ہو اور صرف اُسی کے آگے اطاعت و بندگی میں سر جھکاتا ہو۔جس قوم میں اُنہوں نے آنکھیں کھولی تھیں وہ اگرچہ اُس زمانے میں دنیا کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ قوم تھی' لیکن گمراہی میں بھی وہی سب سے آگے تھی۔علوم وفنون اور

صنعت وحرفت میں ترقی کر لینے کے باوجود اُن لوگوں کو اتنی ذراسی بات نہ سوجھتی تھی کہ مخلوق کبھی معبود ہونے کا اہل نہیں ہوسکتا۔ اُن کے ہاں ستاروں اور بتوں کی پرستش ہوتی تھی۔ نجوم، فال گیری، غیب گوئی، جادوٹونے اور تعویذ گنڈے کا خوب چرچا تھا۔ جیسے آج کل ہندوؤں میں پنڈت اور برہمن ہیں اِسی طرح اُس زمانہ میں بھی پجاریوں کا ایک طبقہ تھا جو مندروں کی محافظت بھی کرتا، لوگوں کو پوجا بھی کراتا، شادی اور غمی وغیرہ کی رسمیں بھی ادا کرتا، اور غیب کی خبریں بھی لوگوں کو بتانے کا ڈھونگ رچاتا تھا۔ عام لوگ اُن کے پھندے میں ایسے پھنسے ہوئے تھے کہ اُنہی کو اپنی اچھی اور بری قسمت کا مالک سمجھتے تھے، اُنہی کے اشاروں پر چلتے تھے اور بے چون وچرا اُن کی خواہشات کی بندگی کرتے تھے۔ کیونکہ اُن کا گمان تھا کہ دیوتاؤں کے ہاں اُن پجاریوں کی پہنچ ہے، یہ چاہیں تو ہم پر دیوتاؤں کی عنایت ہوگی، ورنہ ہم تباہ ہوجائیں گے۔ پجاریوں کے اِس گروہ کے ساتھ بادشاہوں کی ملی بھگت تھی۔ عام لوگوں کو اپنا بندہ بنا کر رکھنے میں بادشاہ پجاریوں کے مددگار رہتے اور پجاری بادشاہوں کے۔ ایک طرف حکومت اِن پجاریوں کی پشت پناہی کرتی تھی اور دوسری طرف یہ پجاری لوگوں کے عقیدے میں یہ بات بٹھاتے تھے کہ بادشاہِ وقت بھی خداؤں میں سے ایک خدا ہے، ملک اور رعیت کا مالک ہے، اُس کی زبان قانون ہے اور اُس کو رعایا کی جان ومال پر ہر قسم کے اختیارات حاصل ہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ بادشاہوں کے آگے پورے بندگی کے مراسم بجالائے جاتے تھے تاکہ رعایا کے دل ودماغ پر اُن کی خدائی کا خیال مسلط ہوجائے۔

حضرت ابراہیمؑ کا گھرانا

ایسے زمانے اور ایسی قوم میں حضرت ابراہیم علیہ السلام پیدا ہوئے اور لطف یہ ہے کہ جس گھرانے میں پیدا ہوئے وہ خود پجاریوں کا گھرانا تھا۔ اُن کے باپ دادا اپنی قوم کے پنڈت اور برہمن تھے۔ اِس گھر میں وہی تعلیم اور وہی تربیت اُن کو مل سکتی تھی جو ایک پنڈت زادے کو ملا کرتی ہے۔ اسی قسم کی باتیں بچپن سے کانوں میں پڑتی تھیں۔ وہی پیروں اور پیرزادوں کے رنگ ڈھنگ اپنے بھائی بندوں اور برادری کے لوگوں میں دیکھتے تھے۔ وہی مندر کی گدی اُن کے لیے تیار تھی جس پر بیٹھ کر وہ اپنی قوم کے پیشوا بن سکتے تھے۔ وہی نذر ونیاز اور چڑھاوے جن سے اُن کا خاندان مالا مال ہو رہا تھا اُن کے لیے بھی حاضر تھے، اُسی طرح لوگ اُن کے سامنے بھی ہاتھ جوڑنے اور عقیدت سے سر جھکانے لیے موجود تھے۔ اِسی طرح دیوتاؤں سے رشتہ ملا کر اور غیب گوئی کا ڈھونگ

*

رچا کر وہ ادنیٰ کسان سے لے کر بادشاہ تک ہر ایک کو اپنی پیری کے پھندے میں پھانس سکتے تھے۔ اِس اندھیرے میں جہاں کوئی ایک آدمی بھی حق کو جاننے اور ماننے والا موجود نہ تھا‘ نہ تو اُن کو حق کی روشنی ہی کہیں سے مل سکتی تھی اور نہ کسی معمولی انسان کے بس کا یہ کام تھا کہ اِس قدر زبرست ذاتی اور خاندانی فائدوں کو لات مار کر محض سچائی کے پیچھے دنیا بھر کی مصیبتیں مول لینے پر آمادہ ہو جاتا۔

حضرت ابراہیمؑ کا اعلانِ براءت

مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کوئی معمولی آدمی نہ تھے۔ کسی اور ہی مٹی سے اُن کا خمیر بنا تھا۔ ہوش سنبھالتے ہی اُنہوں نے سوچنا شروع کر دیا کہ یہ سورج‘ چاند اور ستارے جو خود غلاموں کی طرح گردش کر رہے ہیں اور یہ پتھر کے بُت جن کو آدمی خود اپنے ہاتھ سے بناتا ہے اور یہ بادشاہ جو ہم ہی جیسے انسان ہیں‘ آخر یہ خدا کیسے ہو سکتے ہیں؟ جو بچارے خود اپنے اختیار سے جنبش نہیں کر سکتے‘ جن میں آپ اپنی مدد کرنے کی قدرت نہیں‘ جو اپنی موت اور زیست کے بھی مختار نہیں‘ اُن کے پاس کیا دھرا ہے کہ انسان اُن کے آگے عبادت میں سر جھکائے‘ اُن سے اپنی حاجتیں مانگے‘ اُن کی طاقت سے خوف کھائے اور اُن کی خدمت گاری و فرمانبرداری کرے۔ زمین اور آسمان کی جتنی چیزیں ہمیں نظر آتی ہیں یا جن سے کسی طور پر ہم واقف ہیں‘ اِن میں سے تو کوئی بھی ایسی نہیں جو خود محتاج نہ ہو‘ جو خود کسی طاقت سے دبی ہوئی نہ ہو‘ اور جس پر کبھی نہ کبھی زوال نہ آتا ہو۔ پھر جب ان سب کا یہ حال ہے تو پھر اُن میں سے کوئی رب کیسے ہو سکتا ہے؟ جب اُن میں سے کسی نے مجھے پیدا نہیں کیا‘ نہ کسی کے ہاتھ میں میری موت اور زیست کا اور نفع اور نقصان کا اختیار ہے‘ نہ کسی کے ہاتھ میں رزق اور حاجت روائی کی کنجیاں ہیں‘ تو مَیں اُن کو رب کیوں مانوں اور کیوں اُن کے آگے بندگی و اطاعت میں سر جھکاؤں؟ میرا رب تو وہی ہو سکتا ہے جس نے سب کو پیدا کیا‘ جس کے سب محتاج ہیں اور جس کے اختیار میں سب کی موت و زیست اور سب کا نفع و نقصان ہے۔ یہ دیکھ کر حضرت ابراہیمؑ نے قطعی فیصلہ کر لیا کہ جن معبودوں کو میری قوم پوجتی ہے اُن کو میں ہرگز نہ پوجوں گا اور اِس فیصلہ پر پہنچنے کے بعد اُنہوں نے علی الاعلان لوگوں سے کہہ دیا کہ:

﴿اِنِّیۡ بَرِیۡٓءٌ مِّمَّا تُشۡرِکُوۡنَ﴿۷۸﴾ اِنِّیۡ وَجَّہۡتُ وَجۡہِیَ لِلَّذِیۡ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ حَنِیۡفًا وَّ مَاۤ اَنَا مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ﴿۷۹﴾﴾ (الانعام)

’’جن کو تم خدائی میں شریک ٹھہراتے ہو‘ اُن سے میرا کوئی واسطہ نہیں۔ میں نے سب سے منہ

موڑ کر خود کو اُس ذات کی عبادت و بندگی کے لیے خاص کر لیا ہے جس نے آسمان و زمین پیدا کیا' اور میں ہرگز شرک کرنے والا نہیں ہوں''۔

مصائب کے پہاڑ

اِس اعلان کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے' باپ نے کہا میں عاق کر دوں گا اور گھر سے نکال باہر کروں گا۔ قوم نے کہا ہم میں سے کوئی تمھیں پناہ نہ دے گا۔ حکومت بھی اُن کے پیچھے پڑ گئی اور بادشاہ کے سامنے مقدمہ پیش ہوا۔ مگر وہ یکہ و تنہا انسان سب کے مقابلے میں سچائی کی خاطر ڈٹ کر کھڑا ہو گیا۔ باپ کو ادب سے جواب دیا کہ جو علم میرے پاس ہے وہ تمھیں نہیں ملا۔ اِس لیے بجائے اس کے کہ مَیں تمھاری پیروی کروں' تمھیں میری پیروی کرنی چاہیے۔ قوم کی دھمکیوں کے جواب میں اُس کے بتوں کو اپنے ہاتھ سے توڑ کر ثابت کر دیا کہ جنھیں تم پوجتے ہو وہ خود کس قدر بے بس ہیں۔ بادشاہ سے بھرے دربار میں جا کر صاف کہہ دیا کہ تو میرا رب نہیں ہے بلکہ وہ ہے جس کے ہاتھ میں میری اور تیری زندگی و موت ہے اور جس کے قانون کی بندش میں سورج تک جکڑا ہوا ہے۔ آخر شاہی دربار میں فیصلہ ہوا کہ اِس شخص کو زندہ جلا ڈالا جائے۔ مگر وہ پہاڑ سے زیادہ مضبوط دل رکھنے والا انسان' جو خدائے واحد پر ایمان لا چکا تھا اس ہولناک سزا کو بھگتنے کے لیے بھی تیار ہو گیا۔ پھر جب اللہ نے اپنی قدرت سے اُس کو آگ میں جلنے سے بچا لیا تو وہ اپنے گھر بار' عزیز و اقارب' قوم اور وطن سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر صرف اپنی بیوی اور ایک بھتیجے کو لے کر غریب الوطنی میں ملک ملک کی خاک چھاننے کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ جس شخص کے لیے اپنے گھر میں مہنت کی گدی موجود تھی جو اِس پر بیٹھ کر اپنی قوم کا پیر بن سکتا تھا' دولت و عزت دونوں جس کے قدم چومنے کے لیے تیار تھیں' اور جو اپنی اولاد کو بھی اِس مہنتی کی گدی پر مزے لوٹنے کے لیے چھوڑ سکتا تھا' اُس نے اپنے لیے اور اپنی اولاد کے لیے جلا وطنی اور بے سرو سامانی کی زندگی پسند کی۔ کیونکہ (دوسروں کو) دنیا کے جھوٹے خداؤں کے جال میں پھانس کر خود مزے کرنا اُسے گوارا نہ تھا اور اِس کے مقابلے میں یہ گوارا تھا کہ ایک سچے خدا کی بندگی کی طرف لوگوں کو بلائے اور اس جرم کی پاداش میں کہیں چین سے نہ بیٹھ سکے۔

ہجرت

وطن سے نکل کر حضرت ابراہیم علیہ السلام شام' فلسطین' مصر اور عرب کے ملکوں میں پھرتے

*

رہے‘ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اِس مسافرت کی زندگی میں اُن پر کیا گزری ہوگی ۔ مال وزر کچھ ساتھ لے کر نہ نکلے تھے اور باہر نکل کر اپنی روٹی کمانے کی فکر میں نہیں پھر رہے تھے بلکہ رات دن فکر تھی تو یہ تھی کہ لوگوں کو ہر ایک کی بندگی سے نکال کر صرف ایک اللہ کا بندہ بنائیں ۔ اِس خیال کے آدمی کو جب اُس کے اپنے باپ نے اور اُس کی اپنی قوم نے برداشت نہ کیا تو اور کون برداشت کرسکتا تھا؟ کہاں اُس کی آؤ بھگت ہوسکتی تھی؟ ہر جگہ وہی مندروں کے مہنت اور وہی خدائی کے مدّعی بادشاہ موجود تھے اور ہر جگہ وہی جاہل عوام بستے تھے جو اُن جھوٹے خداؤں کے پھندے میں پھنسے ہوئے تھے ۔ اِن لوگوں کے درمیان وہ شخص کہاں چین سے بیٹھ سکتا تھا جو نہ صرف خود ہی اللہ کے سوا کسی کی خدائی ماننے کے لیے تیار نہ تھا‘ بلکہ دوسروں سے بھی علانیہ کہتا پھرتا تھا کہ ایک اللہ کے سوا تمہارا کوئی مالک اور آقا نہیں ہے۔ سب کی آقائی و خداوندی کا تختہ اُلٹ دو اور صرف اُس ایک کے بندے بن کر رہو۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو کسی جگہ قرار نصیب نہ ہوا۔ سالہا سال بے خانماں پھرتے رہے‘ کبھی کنعان کی بستیوں میں ہیں تو کبھی مصر میں اور کبھی عرب کے ریگستان میں ۔ اِسی طرح ساری جوانی بیت گئی اور کالے بال سفید ہوگئے ۔

اولاد اور اُس کی تربیت

اَخیر عمر میں جب ۹۰ برس پورے ہونے میں صرف چار سال باقی تھے اور اولاد سے مایوسی ہوچکی تھی‘ اللہ نے اولاد دی۔ لیکن اُس اللہ کے بندے کو اب بھی یہ فکر نہ ہوئی کہ خود خانماں برباد ہوا ہوں تو کم از کم اپنے بچوں ہی کو دنیا کمانے کے قابل بناؤں اور اُنہیں کسی ایسے کام پر لگا جاؤں کہ روٹی کا سہارا مل جائے۔ نہیں‘ اُس بوڑھے مسلمان کو فکر تھی تو یہ تھی کہ جس مشن کو پھیلانے میں خود اُس نے اپنی عمر کھپا دی تھی کاش کوئی ایسا ہو جو اُس کے مرنے کے بعد بھی اِسی مشن کو پھیلاتا رہے۔ اِسی غرض کے لیے وہ اللہ سے اولاد کا آرزومند تھا‘ اور جب اللہ نے اولاد دی تو اُس نے یہی چاہا کہ اپنے کام کو جاری رکھنے کے لیے اُنہیں تیار کرے ۔ اِس انسانِ کامل کی زندگی ایک سچے اور اصلی مسلمان کی زندگی تھی ۔ ابتدائے جوانی میں ہوش سنبھالنے کے بعد ہی جب اُس نے اپنے خدا کو پہچانا اور پالیا تو خدا نے اُس سے کہا تھا کہ اَسۡلِمۡ (اسلام لے آ‘ اپنے آپ کو میرے سپرد کر دے‘ میرا ہو کر رہ۔) اور اُس نے جواب میں قول دے دیا تھا کہ اَسۡلَمۡتُ لِرَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ۝ (البقرہ:۱۳۱) ”میں نے اسلام قبول کیا‘ میں ربّ العالمین

کا ہوگیا' میں نے اپنے آپ کو اُس کے سپرد کردیا''۔ اِس قول وقرار کو اُس سچے آدمی نے تمام عمر پوری پابندی کے ساتھ نباہ کر دکھادیا۔ اُس نے ربّ العالمین کی خاطر صدیوں کے آبائی مذہب اور اُس کی رسموں اور عقیدوں کو چھوڑا' اور دنیا کے ان سارے فائدوں کو چھوڑا' اپنی جان کو آگ کے خطرے میں ڈالا' جلاوطنی کی مصیبتیں سہیں' ملک ملک کی خاک چھانی' اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ ربّ العالمین کی اطاعت اور اُس کے دین کی تبلیغ میں صرف کر دیا' اور بڑھاپے میں جب اولاد نصیب ہوئی تو اُس کے لیے بھی یہی دین اور یہی کام پسند کیا۔

سب سے بڑی آزمائش

مگر اِن آزمائشوں کے بعد ایک اور آخری آزمائش باقی رہ گئی تھی' جس کے بغیر یہ فیصلہ نہ ہوسکتا تھا کہ یہ شخص دنیا کی ہر چیز سے بڑھ کر ربّ العالمین سے محبت رکھتا ہے۔ اور وہ آزمائش یہ تھی کہ اِس بڑھاپے میں جب کہ پوری مایوسی کے بعد اُسے اولاد نصیب ہوئی ہے' اپنے اکلوتے بیٹے کو ربّ العالمین کی خاطر قربان کر سکتا ہے یا نہیں؟ چنانچہ یہ آزمائش بھی کر ڈالی گئی اور جب اشارہ پاتے ہی وہ اپنے بیٹے کو اپنے ہاتھ سے ذبح کرنے پر آمادہ ہوگیا' تب فیصلہ فرمادیا گیا کہ ہاں اب تم نے اپنے مسلم ہونے کے دعوے کو بالکل سچ کر دکھایا۔ اب تم اِس کے اہل ہو کہ تمھیں ساری دنیا کا امام بنایا جائے۔ اِسی بات کو قرآن میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ:

﴿وَاِذِ ابْتَلٰۤى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِىْ ؕ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۲۴﴾﴾ (البقرۃ)

''اور جب ابراہیمؑ کو اُس کے رب نے چند باتوں میں آزمایا اور وہ اُن میں پورا اتر گیا تو فرمایا کہ میں تجھ کو انسانوں کا امام (پیشوا) بناتا ہوں۔ اُس نے عرض کیا اور میری اولاد کے متعلق کیا حکم ہے؟ جواب دیا اُن میں سے جو ظالم ہوں گے اُنھیں میرا عہد نہیں پہنچتا''۔

تعمیر کعبہ اور ندائے حج

پھر یہیں دونوں باپ بیٹوں نے اسلامی تحریک کا وہ مرکز تعمیر کیا جو کعبہ کے نام سے آج ساری دنیا میں مشہور ہے۔ اس مرکز کا انتخاب اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا تھا اور خود ہی اس تعمیر کی جگہ تجویز کی تھی۔ یہ عمارت محض ایک عبادت گاہ ہی نہ تھی' جیسے مسجدیں ہوا کرتی ہیں بلکہ اول روز ہی سے اس کو دین اسلام کی عالمگیر تحریک کا مرکز تبلیغ واشاعت قرار دیا گیا تھا اور اُس کی غرض یہ تھی کہ ایک اللہ کے ماننے والے ہر جگہ سے کھنچ کھنچ کر یہاں جمع

*

ہوا کریں‘ مل کر اللہ کی عبادت کریں اور اسلام کا پیغام لے کر پھر اپنے اپنے ملکوں کو واپس جائیں۔ یہی اجتماع تھا جس کا نام ”حج“ رکھا گیا۔ اس کی پوری تفصیل کہ یہ مرکز کس طرح تعمیر ہوا‘ کن جذبات اور کن دعاؤں کے ساتھ دونوں باپ‘ بیٹوں نے اس عمارت کی دیواریں اٹھائیں اور کیسے حج کی ابتدا ہوئی‘ قرآن مجید میں یوں بیان کی گئی ہے:

﴿اِنَّ اَوَّلَ بَیۡتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیۡ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا وَّ ہُدًی لِّلۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۹۶﴾ فِیۡہِ اٰیٰتٌۢ بَیِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبۡرٰہِیۡمَ ۬ۚ وَ مَنۡ دَخَلَہٗ کَانَ اٰمِنًا ؕ﴾ (آل عمران:۹۶‘ ۹۷)

”یقیناً پہلا گھر جو لوگوں کے لیے مقرر کیا گیا وہی تھا جو مکہ میں تعمیر ہوا برکت والا گھر‘ اور سارے جہان والوں کے لیے مرکز ہدایت۔ اس میں اللہ کی کھلی ہوئی نشانیاں ہیں‘ مقامِ ابراہیمؑ ہے اور جو اس میں داخل ہو جاتا ہے اس کو امن مل جاتا ہے۔“

﴿اَوَ لَمۡ یَرَوۡا اَنَّا جَعَلۡنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّ یُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنۡ حَوۡلِہِمۡ﴾

(العنکبوت:۶۷)

”کیا لوگوں نے دیکھا نہیں کہ ہم نے کیسا پر امن حرم بنایا ہے‘ حالانکہ اس کے گرد و پیش لوگ اُچک لیے جاتے ہیں (یعنی جب کہ عرب میں ہر طرف لوٹ مار‘ قتل و غارت گری اور جنگ و جدل کا بازار گرم تھا اس حرم میں ہمیشہ امن ہی رہا۔ حتیٰ کہ وحشی بدو تک اس کے حدود میں اپنے باپ کے قاتل کو بھی دیکھ پاتے تو اس پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہ کرتے)۔“

﴿وَ اِذۡ یَرۡفَعُ اِبۡرٰہٖمُ الۡقَوَاعِدَ مِنَ الۡبَیۡتِ وَ اِسۡمٰعِیۡلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ﴿۱۲۷﴾ رَبَّنَا وَ اجۡعَلۡنَا مُسۡلِمَیۡنِ لَکَ وَ مِنۡ ذُرِّیَّتِنَاۤ اُمَّۃً مُّسۡلِمَۃً لَّکَ ۪ وَ اَرِنَا مَنَاسِکَنَا وَ تُبۡ عَلَیۡنَا ۚ اِنَّکَ اَنۡتَ التَّوَّابُ الرَّحِیۡمُ ﴿۱۲۸﴾ رَبَّنَا وَ ابۡعَثۡ فِیۡہِمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡہُمۡ یَتۡلُوۡا عَلَیۡہِمۡ اٰیٰتِکَ وَ یُعَلِّمُہُمُ الۡکِتٰبَ وَ الۡحِکۡمَۃَ وَ یُزَکِّیۡہِمۡ ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ ﴿۱۲۹﴾﴾ (البقرۃ)

”اور جب ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ اس گھر کی بنیادیں اٹھا رہے تھے تو دعا کرتے جاتے تھے کہ پروردگار! ہماری اس کوشش کو قبول فرما‘ تو سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔ پروردگار! اور تو ہم دونوں کو اپنا مسلم (اطاعت گزار) بنا اور ہماری نسل سے ایک ایسی قوم اٹھا جو تیری مسلم ہو‘ اور ہمیں اپنی عبادت کے طریقے بتا اور ہم پر عنایت کی نظر رکھ کہ تو بڑا بخشنے والا اور مہربان ہے۔ پروردگار! اور تو ان لوگوں میں انہی کی قوم سے ایک ایسا رسول بھیجیو جو انہیں تیری آیات سنائے اور ان کو کتاب اور دانائی کی تعلیم دے اور ان کے اخلاق درست کرے۔ یقیناً تو بڑی قوت والا ہے اور بڑا حکیم ہے۔“

فریضۂ حج کے ثمرات

فریضۂ حج کے ثمرات کا ذکر اللہ تعالیٰ نے سورۃ الحج میں اُس آیت کے فوراً بعد کیا جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حج کے لیے ندا لگانے کا حکم دیا گیا:

﴿وَاَذِّنۡ فِی النَّاسِ بِالۡحَجِّ یَاۡتُوۡکَ رِجَالًا وَّعَلٰی کُلِّ ضَامِرٍ یَّاۡتِیۡنَ مِنۡ کُلِّ فَجٍّ عَمِیۡقٍ ﴿۲۷﴾ لِّیَشۡهَدُوۡا مَنَافِعَ لَهُمۡ ......﴾(الحج:۲۷'۲۸)

''اور پکارو لوگوں کو حج کے لیے وہ آئیں گے پیدل بھی اور دبلی اونٹنیوں پر بھی اور وہ آئیں گے دور دراز کی راہوں سے۔ تاکہ وہ حاضر ہوں اپنے فائدوں کے حصول کے لیے''۔

فریضۂ حج سے حاصل ہونے والے فائدے یعنی ثمرات انفرادی و اجتماعی دونوں اعتبار سے ہیں۔

انفرادی ثمرات

(۱) مادّہ پرستی کی نفی :

انفرادی اعتبار سے سفرِ حج موجودہ دور کے سب سے پھیلے ہوئے شرک مادہ پرستی کی نفی ہے۔ عام طور پر سفر دو مقاصد کے تحت کیا جاتا ہے۔ایک مال کمانے کے لیے اور دوسرا سیر و تفریح کے لیے۔ حج کے لیے سفر کا معاملہ اِن سے بالکل مختلف ہے۔ یہ سفر اپنی کسی غرض یا نفس کی خواہش کے لیے نہیں بلکہ صرف اللہ کی رضا کے حصول کے لیے اور اُس فرض کو ادا کرنے کے لیے کیا جاتا ہے جو اللہ نے مقرر کیا ہے۔ جو شخص اپنے گھر بار سے ایک لمبی مدت کے لیے سفر کی تکلیفیں گوارا کر کے حج کو نکلتا ہے' اپنے بال بچوں اور عزیزوں سے جدا ہوتا ہے' گھر کی آسائشیں ترک کرتا ہے' اپنا مال خرچ کرتا ہے' اپنا وقت صرف کرتا ہے' یہ سب اِس بات کی دلیل ہے کہ اُس کے دل میں اللہ کا خوف بھی ہے اور اُس کی محبت بھی' اور اُسے فرض کی ادائیگی کا احساس بھی ہے۔ اُس کا یوں نکلنا اِس بات کا ثبوت ہے کہ اگر کسی وقت اللہ کی راہ میں نکلنے کی ضرورت پیش آئے تو وہ نکل سکتا ہے' تکلیفیں اٹھا سکتا ہے' اپنے مال اور اپنی راحت کو اللہ کی خوشنودی پر قربان کر سکتا ہے۔

*

(۲) نیکی اور تقویٰ کی رغبت :

جب کوئی فرد حج کی ادائیگی جیسے پاک ارادے سے سفر کے لیے تیار ہوتا ہے تو اُس کی طبیعت کا حال کچھ اور ہی ہو جاتا ہے۔ اُس کا دل اللہ کی محبت سے لبریز ہو جاتا ہے' اُسے پاکیزہ خیال آنے شروع ہو جاتے ہیں' برائی سے اُسے نفرت ہونے لگتی ہے اور قدرتی طور پر بھلائی کی طرف اُس کی رغبت بڑھ جاتی ہے۔ وہ گناہوں سے توبہ کرتا ہے اور دوسرے بندوں سے بھی زیادتیوں کی معافی مانگتا ہے تاکہ اللہ کے دربار میں بندوں کے حقوق کا بوجھ لادے ہوئے نہ جائے۔ پھر سفر کے لیے نکلنے کے ساتھ جتنا جتنا وہ بیت اللہ کی طرف بڑھتا چلا جاتا ہے اتنا ہی اُس کے اندر نیکی کا جذبہ بھی بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اُس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ کسی کو اُس سے اذیت نہ پہنچے اور جس کی جتنی خدمت یا مدد ہو سکے وہ کر ڈالے۔ بدکلامی و بیہودگی' بداخلاقی و بے حیائی' بددیانتی اور جھگڑا فساد کرنے سے خود اُس کی اپنی طبیعت اندر سے رکتی ہے کیونکہ ممکن نہیں کہ وہ حرمِ الٰہی کا مسافر ہو اور پھر برے کام کرتا ہوا جائے۔ اُس کا یہ سفر پورے کا پورا عبادت ہے۔ اِس عبادت کی حالت میں ظلم و فسق کا کیا کام؟ پس دوسرے تمام سفروں کے برعکس یہ ایسا سفر ہے جو ہر دم آدمی کے نفس کو پاک کرتا رہتا ہے۔ یہ ایک بہت بڑا اصلاحی کورس ہے جس سے لازماً ہر وہ انسان گزرتا ہے جو حج کے لیے جاتا ہے۔ پھر اِس سفر میں پرہیزگاری اور تقویٰ کے ساتھ مسلسل اللہ کی یاد اور اللہ کی طرف شوق و عشق کی جو کیفیت آدمی پر گزرتی ہے وہ ایک ایسا مستقل نقش دل پر چھوڑ جاتی ہے جس کا اثر برسوں قائم رہتا ہے۔

(۳) اپنی حیثیت اور اوقات کا احساس :

حج کے سفر کے دوران ایک خاص حد ایسی آتی ہے جس سے کوئی مسلمان جو مکہ جانا چاہتا ہو' احرام باندھے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا۔ احرام باندھ کر انسان کو اللہ کے سامنے اپنی اصل حیثیت اور اوقات کا احساس ہو جاتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ﴿١٥﴾﴾ (فاطر)

''اے لوگو! تم سب فقیر ہو اللہ تبارک وتعالیٰ کے دربار میں' اور اللہ تبارک وتعالیٰ ہی ہے جو کہ غنی ہے' آپ سے آپ محمود ہے''۔

یہ احرام کیا ہے؟ ایک فقیرانہ لباس ہے جس میں ایک تہ بند' ایک چادر اور ایک جوتی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ اب تک جو کچھ تم تھے سو تھے مگر اب جو تمہیں اللہ کے دربار

میں جانا ہے تو فقیر بن کر چلو۔ ظاہر میں بھی فقیر بنو اور دل کے فقیر بھی بننے کی کوشش کرو۔ رنگین کپڑے اور آرائش کے لباس اتارو۔ سادہ اور درویشانہ طرز کا لباس پہن لو۔ موزے نہ پہنو، سر کھلا رکھو، خوشبو نہ لگاؤ، بال نہ بناؤ، ہر قسم کی زینت سے پرہیز کرو، شوہر اور بیوی کا تعلق نہ صرف ختم کردو بلکہ ایسی حرکات وسکنات اور ایسی باتوں سے بھی پرہیز کرو جو اِس تعلق کا شوق یا اس کی یاد دلانے والی ہوں۔ شکار نہ کرو بلکہ شکاری کو شکار کا پتا بتانے سے بھی اجتناب کرو۔ ظاہر میں جب انسان یہ رنگ اختیار کرے گا تو باطن پر بھی اِس کا اثر پڑے گا۔ اندر سے دل بھی فقیر بنے گا، کبر وغرور نکلے گا، مسکینی اور امن پسندی پیدا ہوگی، دنیا اور اُس کی لذتوں میں پھنسنے سے جو کچھ آلائشیں روح کو لگ گئی تھیں وہ صاف ہوں گی۔ خدا پرستی کی کیفیت انسان کے ظاہر پر بھی طاری ہوگی اور باطن پر بھی۔

(۴) بیت اللہ کی زیارت سے ایمانی کیفیات کو جلا :

بیت اللہ کی زیارت ایک ایسا روح پرور منظر ہے جس سے انسان کی ایمانی کیفیات کو زبردست جلا حاصل ہوتی ہے۔ بیت اللہ کے حوالے سے ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

﴿اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِىْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝٩٦ فِيْهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ......﴾ (آل عمران: ٩٦ - ٩٧)

”بے شک پہلا گھر جو مقرر کیا گیا لوگوں (کی عبادت) کے لیے یقیناً وہ مکہ میں ہے، برکت والا ہے اور وہ ہدایت (کا ذریعہ) ہے تمام جہان والوں کے لیے۔ اِس میں بڑی واضح نشانیاں ہیں......“

دن ہو یا رات اللہ کی واضح نشانیاں بیت اللہ پر ایک برستے ہوئے نور کی طرح محسوس ہوتی ہیں۔ اِس گھر کی زیارت سے انسان کا جی ہی نہیں بھرتا۔ یہ وہ گھر ہے جس کا دیکھنا بھی باعثِ اجر وثواب ہے۔ جس کے گرد پھیرے لگانے یعنی طواف کرنے سے انسان کے اللہ کے ساتھ عشق کے جذبات کی تسکین کا سامان ہوتا ہے اور ایک عجیب روحانی سرور انسان کے باطن میں محسوس ہوتا ہے۔ اِس گھر کو دیکھ کر بار بار یہ خیال آتا ہے کہ یہی وہ گھر ہے جس سے اللہ کے رسول ﷺ کو والہانہ محبت تھی۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

﴿قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِى السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ۪ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۭ﴾ (البقرة : ١٤٤)

*

''(اے نبیؐ) ہم دیکھ رہے ہیں آپؐ کے چہرے کا بار بار اُٹھنا آسمان کی طرف، پس ہم پھیرے دیتے ہیں آپؐ کے چہرے کو اُس قبلہ کی طرف کہ جس سے آپؐ محبت کرتے ہیں، تو پھیر لیجئے اپنے چہرے (رخ) کو مسجدِ حرام کی طرف''۔

بیت اللہ کی زیارت کی حسین یاد ہمیشہ انسان کے ذہن میں محفوظ رہتی ہے اور اُس کے ایمان کو تازہ کرتی رہتی ہے۔

(۵) اللہ کی ذات پر ایمان میں اضافہ :

حرم میں قیام کے دوران بعض ایسے امور سامنے آتے ہیں جن سے انسان کے اللہ کی ذات پر ایمان اور توکل میں گراں قدر اضافہ ہوتا ہے۔ ان امور کا تعلق حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعاؤں سے ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی تھی:

﴿رَبِّ اجۡعَلۡ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارۡزُقۡ اَهۡلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ﴾ (البقرہ:۱۲۶)

''اے میرے ربّ! تو بنا دے اِس (مکہ) کو امن والا شہر اور تو رزق عطا فرما اِس شہر کے بسنے والوں کو پھلوں میں سے''۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی امن اور رزق کے حوالے سے اِن دونوں دعاؤں کو قبول فرمایا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

﴿اَوَلَمۡ يَرَوۡا اَنَّا جَعَلۡنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنۡ حَوۡلِهِمۡ ؕ اَفَبِالۡبَاطِلِ يُؤۡمِنُوۡنَ وَبِنِعۡمَةِ اللّٰهِ يَكۡفُرُوۡنَ ۝٦٧﴾ (العنکبوت)

''کیا وہ نہیں دیکھتے کہ بے شک ہم نے حرم کو بنا دیا ہے امن کی جگہ اور اُچک لیے جاتے ہیں لوگ اُن کے آس پاس سے؟ تو کیا یہ پھر بھی باطل پر ایمان لائیں گے اور اللہ تعالیٰ کی نعمت کا انکار کریں گے؟''

اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ کے گرد کچھ ایسی حدود مقرر فرما دیں جنہیں حدودِ حرم کہا جاتا ہے اور وہاں ہر طرح کا جنگ و جدال حرام ٹھہرا دیا ہے۔ یہاں تک کہ دورِ جاہلیت میں بھی اکثر و بیشتر اِن حدود کا احترام کیا جاتا رہا اور لوگوں کو بیت اللہ کے قریب ہر طرح کی خونریزی سے عافیت حاصل رہی۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو رہتی دنیا تک ایک ایسا حرم دیا جہاں امن و امان کا یہ عالم ہے کہ آدمی تو کیا جانور تک کا شکار نہیں کیا جا سکتا۔ جس میں ہتھیار لانے کی ممانعت ہے۔ جس میں گھاس تک کاٹنے کی اجازت نہیں۔ جس کی زمین کا کانٹا تک نہیں توڑا جا سکتا۔ جس میں حکم

ہے کہ کسی کی کوئی چیز گری پڑی ہو تو اُسے ہاتھ تک نہ لگاؤ۔ اِسی لیے بیت اللہ کے حوالے سے ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

﴿وَمَنۡ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ؕ﴾ (آل عمران:۹۷)

''اور جو کوئی بھی اِس (گھر) میں داخل ہو گیا وہ آ گیا امن میں''۔

مزید یہ کہ اللہ تعالیٰ نے لازم فرمایا کہ سال کے چار مہینے جو حج اور عمرہ کے لیے مقرر کیے گئے ہیں' اُن میں کوشش کی جائے کہ کعبہ کی طرف آنے والے تمام راستوں میں امن قائم رہے۔ گویا دعائے ابراہیمی کو اللہ تعالیٰ نے اِس طرح شرفِ قبولیت بخشا کہ بیت اللہ دنیا میں امن قائم رکھنے کا سب سے بڑا ذریعہ بن گیا۔ اگر دنیا کی سیاست کی باگیں شریعت کے مطابق ہوں تو پوری کوشش کی جائے گی کہ دنیا میں ایسی بدامنی برپا نہ ہونے پائے جس سے حج اور عمرے کا نظام معطل ہو جائے۔

یہ تو اللہ کی رحمت ہوئی امن کے حوالے سے۔ رزق کے حوالے سے ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

﴿اَوَلَمۡ نُمَكِّنۡ لَّهُمۡ حَرَمًا اٰمِنًا يُّجۡبٰۤى اِلَيۡهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَىۡءٍ رِّزۡقًا مِّنۡ لَّدُنَّا......﴾ (القصص:۵۷)

''تو کیا ہم نے اُن کے لیے آباد نہیں کیا اِس حرمت اور امن والی جگہ کو؟ کھنچے چلے آتے ہیں میوے ہر طرح کے اِس کی طرف جو رزق ہے ہماری طرف سے......''

حرم کی سرزمین وَادٍ غَيۡرِ ذِىۡ زَرۡعٍ یعنی بالکل بنجر زمین ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی عجیب قدرت ہے کہ وہاں رزق کی فراوانی ہے۔ کھانے پینے کی ہر نعمت وہاں وافر مقدار میں دستیاب ہوتی ہے اور اِن اشیاءِ خورد و نوش کی قیمت بھی امکانی حد تک بڑھنے نہیں دی جاتی۔

امن اور رزق کے علاوہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا بھی کی کہ یہ گھر آباد رہے اور لوگوں کے اندر یہاں آنے کی تڑپ پیدا ہوتی رہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام بارگاہِ خداوندی میں یوں عرض کرتے ہیں :

﴿رَبَّنَاۤ اِنِّىۡۤ اَسۡكَنۡتُ مِنۡ ذُرِّيَّتِىۡ بِوَادٍ غَيۡرِ ذِىۡ زَرۡعٍ عِنۡدَ بَيۡتِكَ الۡمُحَرَّمِۙ رَبَّنَا لِيُقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ فَاجۡعَلۡ اَفۡـئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهۡوِىۡۤ اِلَيۡهِمۡ......﴾ (ابراھیم:۳۷)

''اے ہمارے ربّ! بے شک میں نے اپنی اولاد میں سے ایک شاخ کو لا بسایا ایک ایسی وادی میں جو کہ بنجر ہے تیرے محترم گھر کے پاس' اے ربّ ہمارے! اِس لیے تاکہ وہ

*

وہاں قائم کریں نماز۔ تو اے اللہ! تو لوگوں کے دلوں کو کر دے اُن کی طرف مائل ......''

اِس دعا کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا:

﴿وَاَذِّنۡ فِی النَّاسِ بِالۡحَجِّ یَاۡتُوۡکَ رِجَالًا وَّعَلٰی کُلِّ ضَامِرٍ یَّاۡتِیۡنَ مِنۡ کُلِّ فَجٍّ عَمِیۡقٍ ﴿۲۷﴾﴾ (الحج)

''اور پکارو لوگوں کو حج کے لیے' وہ آئیں گے پیدل بھی اور دبلی اونٹنیوں پر بھی' اور وہ آئیں گے دور دراز کی راہوں سے''۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حج کے لیے پکار لگائی۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت دیکھیے یہ پکار سنی گئی اور کرۂ ارضی کے سارے گوشوں اور خشکی اور تری کی ساری راہوں سے اِس پکار کی بازگشت بلند ہوئی۔ انجن اور برق کی تیز رفتار سواریوں کے ذریعے نہیں' تار اور لاسلکی کے گاڑے ہوئے ستونوں پر سے نہیں بلکہ دلوں کے اعتقاد اور روح کے ایمان کے ذریعے یہ پکار سب نے سنی۔ یہی وجہ ہے کہ ہر سال لاکھوں انسانوں کے دلوں میں اِس پکار پر لبیک کہنے کی آرزو پیدا ہوتی ہے اور وہ کثیر مال اور وافر وقت کی قربانی دیتے ہوئے اِس پکار کا جواب یوں دیتے ہیں:

لَبَّیۡکَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیۡکَ ، لَبَّیۡکَ لَا شَرِیۡکَ لَکَ لَبَّیۡکَ ، اِنَّ الۡحَمۡدَ وَالنِّعۡمَةَ لَکَ وَالۡمُلۡکَ ، لَا شَرِیۡکَ لَکَ.

''میں حاضر ہوں میرے اللہ میں حاضر ہوں' میں حاضر ہوں تیرا کوئی شریک نہیں میں حاضر ہوں' یقیناً تعریف سب تیرے ہی لیے ہے' نعمت سب تیری ہے' اور ساری بادشاہی تیری ہے۔ تیرا کوئی شریک نہیں''۔

بیت اللہ میں ایک بار حاضری کے بعد تو دلوں میں آتشِ شوق اور بڑھ جاتی ہے اور بار بار اس گھر میں آنے کی خواہش مچلنے لگتی ہے۔ اِسی حوالے سے ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَاِذۡ جَعَلۡنَا الۡبَیۡتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمۡنًا ؕ﴾ (البقرۃ: ۱۲۵)

''اور جب ہم نے خانہ کعبہ کو لوگوں کے بار بار لوٹ کر آنے اور امن کی جگہ بنا دیا''۔

(۶) کثرت سے اللہ سے مانگنے کی توفیق:

حج کے لیے حرم میں حاضری کے موقع پر کثرت سے اللہ تعالیٰ سے مانگنے کی توفیق ملتی ہے جس سے اللہ پر توکل اور بھروسہ میں اضافہ ہوتا ہے۔ طواف کے دوران' طواف کے بعد مقامِ ابراہیمؑ پر نوافل کی ادائیگی کے بعد' آبِ زم زم سے سیراب ہو کر' صفا اور مروہ کے درمیان سعی

کرتے ہوئے‘ منیٰ‘ عرفات اور مزدلفہ میں قیام کے دوران اللہ تبارک وتعالیٰ سے کثرت سے دعائیں کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ دعاؤں کے دوران اللہ سے کیا مانگا جائے‘ قرآنِ حکیم نے اِس کی بھی رہنمائی عطا فرمائی ہے :

﴿فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ﴿٢٠٠﴾ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿٢٠١﴾ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿٢٠٢﴾﴾ (البقرة)

’’اور لوگوں میں سے وہ بھی ہیں جو دعا کرتے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہمیں دنیا ہی میں عطا فرما‘ اور ایسے لوگوں کا آخرت میں کچھ حصہ نہیں۔ اور اُن میں سے وہ بھی ہیں جو دعا کرتے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں بھی بھلائی عطا فرما اور آخرت میں بھی بھلائی عطا فرما اور ہمیں بچالے جہنم کے عذاب سے۔ یہی لوگ ہیں جن کے لیے حصہ ہے اُن کی (نیک اعمال والی) کمائی میں سے‘ اور اللہ جلد ہی حساب لینے والا ہے‘‘۔

بار بار اللہ تبارک وتعالیٰ سے لو لگانے سے انسان کا اللہ سے تعلق مضبوط ہوتا ہے۔ کثرت سے اللہ سے مانگنے سے انسان کو خود احتسابی کی توفیق بھی حاصل ہوتی ہے۔ انسان غور کرتا ہے کہ اگر میں چاہتا ہوں کہ اللہ میری دعائیں سنے تو کیا میں بھی اللہ کے احکامات پر عمل کرتا ہوں۔ یہ احساس انسان کی اصلاح کا ذریعہ بنتا ہے۔

(۷) نماز‘ روزہ‘ زکوٰۃ کی برکات کا مجموعہ :

اللہ تعالیٰ نے ہمیں جو بھی عبادات عطا فرمائی ہیں اُن میں ہماری تربیت وتزکیہ کا سامان ہے۔ نماز بار بار اللہ کی یاد تازہ کرنے کا ذریعہ ہے :

﴿اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِیْ﴾ (طٰہٰ : ۱۴)

’’نماز قائم کرو میری یاد کے لیے‘‘۔

روزہ کی عبادت ہماری روح کو تقویت دینے‘ جسم پر اِس کی گرفت مضبوط کرنے اور نفس کے منہ زور گھوڑے کو قابو میں رکھنے کا بڑا مؤثر ذریعہ ہے۔ اِس عمل سے اللہ کی نافرمانی سے بچنے کی صلاحیت انسان میں پیدا ہوتی ہے جسے تقویٰ کہا جاتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

*

﴿يٰـاَيُّـهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا كُتِبَ عَلَيۡكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِكُمۡ لَعَلَّكُمۡ تَتَّقُوۡنَ ﴿۱۸۳﴾﴾ (البقرۃ)

''اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! تم پر روزہ فرض کر دیا گیا ہے جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیا گیا تھا تاکہ تم بچ سکو (اللہ کی نافرمانی سے!)''

زکوٰۃ انسان کے دل سے مال یعنی دنیا کی محبت نکالنے کا ذریعہ ہے۔ نبی اکرم ﷺ سے فرمایا گیا:

﴿خُذۡ مِنۡ اَمۡوَالِهِمۡ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمۡ وَتُزَكِّيۡهِمۡ بِهَا......﴾ (التوبہ : ۱۰۳)

''ان کے اموال میں سے صدقات وصول کیجئے تاکہ آپ ﷺ اِس کے ذریعے سے اُنہیں پاک کریں اور اُن کا تزکیہ کریں''۔

دل سے دنیا کی محبت نکلتی ہے تو گویا انسان کا تزکیہ ہوتا ہے اور اب اُس کا دل اللہ کی محبت سے منور ہوتا ہے۔ حج کی عبادت اِن تمام برکات کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے جو نماز، روزہ اور زکوٰۃ سے حاصل ہوتی ہیں۔ حج میں نماز کی طرح بار بار اللہ کو یاد کرنے کا عمل بھی ہے، احرام میں روزہ کی طرح کچھ پابندیاں بھی ہیں اور سفرِ حج کے لیے زکوٰۃ کی طرح اللہ کی خوشنودی کے لیے اپنا مال پیش کرنے کی قربانی بھی ہے۔ گویا حج کے ذریعے ہمیں وہ تمام سعادتیں حاصل ہوتی ہیں جو نماز، روزے اور زکوٰۃ سے علیحدہ علیحدہ حاصل ہوتی ہیں۔

(۸) اللہ کے حکم کی اہمیت کا احساس :

مناسکِ حج کے دوران بار بار یہ احساس ہوتا ہے کہ اہمیت نہ کسی جگہ کی ہے، نہ وقت کی ہے اور نہ کسی اور ضابطہ کی ہے، بلکہ صرف اور صرف اللہ کے حکم کی ہے۔ مثال کے طور پر ایک حدیثِ نبوی ﷺ کی رُو سے مسجد حرام میں نماز پڑھنے کا اجر باقی مساجد کے مقابلہ میں ایک لاکھ گنا زیادہ ہے، لیکن ۸ ذی الحج کو اللہ کا حکم ہے کہ نمازیں منیٰ میں ادا کرو۔ عام دنوں میں میدانِ عرفات میں عبادت کا کوئی خصوصی اجر و ثواب نہیں لیکن ۹ ذی الحج کو وقوفِ عرفات سال بھر کی اہم ترین عبات ہے۔ روزانہ حکم ہے کہ نمازِ مغرب غروبِ آفتاب کے فوراً بعد ادا کرلو لیکن ۹ ذی الحج کو حکم یہ ہے کہ اِسے تاخیر کے ساتھ نمازِ عشاء کے ساتھ ملا کر مزدلفہ میں ادا کرو۔ گویا اصل اہمیت اللہ کے حکم کی ہے کہ وہ جس وقت، جس جگہ اور جس ضابطہ کو چاہے اہمیت عطا فرما دے۔

اجتماعی ثمرات

حج کی عبادت کے اجتماعی ثمرات سمجھنے کے حوالے سے یہ بات پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ دنیا بھر کے مسلمانوں کے لیے حج کا ایک ہی زمانہ رکھا گیا ہے اور لاکھوں کی تعداد میں مسلمان مل کر ایک وقت میں حج ادا کرتے ہیں۔ عبادات کو اجتماعی صورت دینے کی بڑی حکمتیں ہیں۔ باجماعت نماز سے وقت کی پابندی، ایک امام کی پیروی میں نظم وضبط، باہم میل جول سے اخوت اور ایک دوسرے کے دکھ درد میں شرکت جیسے کئی فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ رمضان المبارک میں ایک ساتھ روزے رکھنے کا حکم دے کر نیکی اور تقویٰ کی ایک پاکیزہ فضا قائم کر دی جاتی ہے۔ زکوٰۃ کی وصولی اور خرچ کے لیے اجتماعی نظام قائم کر کے مستحقین کے لیے خیر و برکت کے کئی دروازے کھول دیے گئے ہیں۔ یہی معاملہ حج کا بھی ہے۔ اکیلا اکیلا آدمی حج کرے، تب بھی اُس کی زندگی میں بہت بڑا انقلاب آ سکتا ہے، مگر تمام دنیا کے مسلمانوں کے لیے ایک ہی وقت میں مل کر حج کرنے کا قاعدہ مقرر کر کے کئی اجتماعی ثمرات کا سامان کیا گیا ہے۔

(ا) بستی بستی نیکی کے اثرات :

حج کا ارادہ کرتے ہی نیک جذبات انسان پر طاری ہوتے ہیں اور واپسی کے بعد بھی کچھ عرصہ تک اِن کا اثر رہتا ہے۔ یہ نیک جذبات دوسروں پر بھی پاکیزہ اثرات ڈالتے ہیں۔ ہر بستی میں ایسے مسلمانوں کی اچھی خاصی تعداد ہوتی ہے جو ہر سال حج کا ارادہ کر کے نکلتے ہیں۔ ہر شہر میں اُن کی تعداد ہزاروں اور ہر ملک میں لاکھوں کے قریب ہوتی ہے۔ گویا پوری دنیا میں بستی بستی لوگوں پر نیکی اور تقویٰ کے اثرات پڑتے ہیں۔ دنیا کے کونے کونے میں جہاں جہاں بھی مسلمان بستے ہیں، حج کا موسم آنے کے ساتھ ہی کس طرح اسلام کی زندگی جاگ اٹھتی ہے اور کیسی کچھ حرکت پیدا ہوتی ہے۔ پھر یہ کیفیت کتنے مہینوں تک رہتی ہے۔ تقریباً شوال کے مہینے سے لے کر ذی القعدہ تک دنیا کے مختلف حصوں سے مختلف لوگ حج کی تیاریاں کر کے نکلتے ہیں اور اُدھر ذی الحج کے آخر سے ربیع الاوّل تک واپسی کا سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ اس چھ مہینہ کی مدت تک گویا مسلسل تمام روئے زمین کی مسلمان آبادیوں میں ایک طرح کی دینی حرکت جاری رہتی ہے۔ جو لوگ حج کو جاتے اور حج سے واپس آتے ہیں وہ تو دینی کیفیت میں سرشار ہوتے ہی ہیں، مگر جو خود نہیں جاتے اُن کو بھی حاجیوں کے رخصت کرنے اور ایک ایک بستی سے اُن کے

*

گزرنے اور پھر واپسی پر اُن کا استقبال کرنے اور اُن سے حج کے حالات سننے کی وجہ سے اِس کیفیت کا کچھ نہ کچھ حصہ مل ہی جاتا ہے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی ؒ کیا خوب لکھتے ہیں:

''جس طرح رمضان کا مہینہ تمام اسلامی دنیا میں تقویٰ کا موسم ہے' اِسی طرح حج کا زمانہ تمام روئے زمین میں اسلام کی زندگی اور بیداری کا زمانہ ہے۔ شریعت بنانے والی حکیم و دانا ہستی نے ایسا بے نظیر انتظام کر دیا ہے کہ قیامت تک عالمِ اسلام کی بیداری کی عالمگیر تحریک مٹ نہیں سکتی۔ دنیا کے حالات خواہ کتنے ہی بگڑ جائیں اور زمانہ کتنا ہی خراب ہو جائے' مگر بیت اللہ کا یہ مرکز' اسلامی دنیا کے جسم میں کچھ اِس طرح رکھ دیا گیا ہے جیسے آدمی کے جسم میں دل ہوتا ہے۔ جب تک دل حرکت کرتا رہے' آدمی مر نہیں سکتا' چاہے بیماریوں کی وجہ سے وہ ہلنے تک کی طاقت نہ رکھتا ہو۔ بالکل اِسی طرح دنیا کا یہ دل بھی ہر سال اُس کی دُور دراز رگوں تک سے خون کھینچتا رہتا ہے اور پھر اُس کو رگ رگ تک پھیلا دیتا ہے۔ جب تک اِس دل کی یہ حرکت جاری ہے اور جب تک خون کے کھینچنے اور پھیلنے کا یہ سلسلہ چل رہا ہے' اُس وقت تک یہ بالکل محال ہے کہ اِس جسم کی زندگی ختم ہو جائے' خواہ بیماریوں سے یہ کتنا ہی زار و نزار ہو''۔

(۲) اللہ کی پکار پر لبیک کہنے کا جذبہ:

سورۃ الانفال آیت ۲۴ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ......﴾

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! لبیک کہو اللہ اور اُس کے رسول کی پکار پر......''

اللہ کی پکار پر لبیک کہنے کا عمل احرام باندھنے کے ساتھ ہی شروع ہو جاتا ہے۔ جو کلمات حاجی کی زبان سے ہر نماز کے بعد' ہر بلندی پر چڑھتے وقت' ہر پستی کی طرف اترتے وقت' ہر قافلے سے ملتے وقت اور ہر روز صبح نیند سے بیدار ہو کر نکلتے ہیں اور جن کو وہ بلند آواز سے پکارتا ہے' وہ یہ ہیں:

لَبَّيْکَ اَللّٰهُمَّ لَبَّيْکَ ، لَبَّيْکَ لَا شَرِيْکَ لَکَ لَبَّيْکَ ، اِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَکَ وَالْمُلْکَ ، لَا شَرِيْکَ لَکَ.

''میں حاضر ہوں' میرے اللہ میں حاضر ہوں' میں حاضر ہوں' تیرا کوئی شریک نہیں میں حاضر ہوں' یقیناً تعریف سب تیرے ہی لیے ہے' نعمت سب تیری ہے اور ساری بادشاہی تیری ہے۔ تیرا کوئی شریک نہیں''۔

یہ دراصل حج کی اُس ندائے عام کا جواب ہے جو ساڑھے چار ہزار برس پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تبارک وتعالیٰ کے حکم سے لگائی تھی۔ پینتالیس صدیاں قبل اللہ کے اُس منادی نے پکارا تھا کہ اللہ کے بندو! اللہ کے گھر کی طرف آؤ' زمین کے ہر گوشے سے آؤ' خواہ پیدل آؤ' خواہ سواریوں پر آؤ۔ جواب میں آج تک حرم پاک کا ہر مسافر بلند آواز سے کہہ رہا ہے "میں حاضر ہوں' میرے اللہ میں حاضر ہوں' تیرا کوئی شریک نہیں' میں حاضر ہوں"۔ اِس طرح لبیک کی ہر صدا کے ساتھ حاجی کا تعلق سچی اور خالص خداپرستی کی اُس تحریک سے جڑ جاتا ہے جو حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کے وقت سے چلی آ رہی ہے۔ ساڑھے چار ہزار برس کا فاصلہ بیچ میں سے ہٹ جاتا ہے۔ یوں معلوم ہونے لگتا ہے گویا ادھر اللہ کی طرف سے حضرت ابراہیم علیہ السلام پکار رہے ہیں اور ادھر سے حاجی جواب دے رہا ہے۔ وہ جواب دیتا جاتا ہے اور آگے بڑھتا جاتا ہے۔ جوں جوں آگے بڑھتا ہے شوق کی کیفیت اور زیادہ تیز ہوتی جاتی ہے۔ ہر چڑھاؤ اور ہر اتار پر اُس کے کانوں میں اللہ کے منادی کی آواز گونجتی ہے اور وہ اُس پر لبیک کہتا ہوا آگے چلتا ہے۔ ہر قافلہ اُسے وہیں کا پیامی معلوم ہوتا ہے اور ایک عاشق کی طرح یہ اُس کا پیغام سن کر پکارتا ہے "میں حاضر ہوں' اے اللہ! میں حاضر ہوں"۔ ہر نئی صبح اُس کے لیے پیغامِ دوست لاتی ہے اور نور کے تڑکے میں آنکھ کھلتے ہی یہ لَبَّیْکَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ کی صدا لگانے لگتا ہے۔ بار بار لَبَّیْکَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ کی صدا حاجی کو احساس دلاتی ہے کہ اُس نے صرف حج ہی کے لیے نہیں بلکہ اللہ کے ہر مطالبے کے لیے لبیک کہنا ہے۔

(۳) اللہ کی راہ میں مال و جان قربان کرنے کا جذبہ :

حج کے ارادے اور اِس کی تیاری سے لے کر اپنے گھر واپس آنے تک انسان کو کئی قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ اِن میں وقت کی قربانی' مال کی قربانی' آرام و آسائش کی قربانی' بہت سے دُنیوی تعلقات کی قربانی اور بہت سی نفسانی خواہشات اور لذتوں کی قربانی شامل ہے۔ یہ سب کچھ اللہ کی خاطر ہے' کوئی ذاتی غرض اِس میں شامل نہیں۔ یعنی :

﴿ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿١٦٢﴾ ﴾ (الانعام)

"بے شک میری نماز اور میری قربانی اور میرا جینا اور میرا مرنا سب اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا رب ہے"۔

مناسکِ حج میں دوڑ دھوپ' کوچ اور قیام سے مجاہدانہ زندگی کی جو مشق کرائی جاتی ہے اور اللہ کی

*

رضا کے لیے اُس کی راہ میں سب کچھ قربان کرنے کا جو جذبہ پیدا کیا جاتا ہے محسوس ہوتا ہے کہ یہ ایک تربیتی عمل ہے جس سے کسی بڑے مقصد کے حصول کے لیے انسان کو گزارا جا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ ہر وہ مسلمان جو بیت اللہ تک جانے آنے کی قدرت رکھتا ہو' حج کے لیے آئے اور اِس تربیت سے گزرے تاکہ جہاں تک ممکن ہو ہر زمانے میں زیادہ سے زیادہ مسلمان ایسے موجود رہیں جو اس پوری تربیت سے گزر چکے ہوں۔ وہ بڑا مقصد جس کے لیے یہ تربیت دی جا رہی ہے ''اللہ کی زمین پر اللہ کے دین کی سربلندی ہے''۔ یہی وجہ ہے کہ سورۃ البقرۃ میں حج کی تفاصیل بیان کرنے سے قبل اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

﴿وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ؕ﴾ (البقرہ:۱۹۳)

''اور اُن سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ نہ رہے اور دین ہو جائے اللہ کے لیے''۔

سورۃ الحج میں حج کے حوالے سے احکامات دینے کے بعد فرمایا :

﴿اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ﴾ (الحج:۴۱)

''(اللہ کے محبوب بندے وہ ہیں کہ) اگر ہم اُنہیں زمین میں اختیار دیں تو وہ قائم کریں نماز اور ادا کریں زکوٰۃ اور وہ حکم دیں نیکی کا اور وہ روکیں برائی سے''۔

اللہ کے دین کے غلبہ کے لیے جدوجہد وہی کر سکتا ہے جو مال' جان' آرام' دُنیوی تعلقات اور نفسانی خواہشات کی قربانی دے سکے۔ حج کے ذریعے اِسی کی تربیت دی جاتی ہے۔

(۴) اللہ کے محبوب بندوں اور اُن کی قربانیوں کی یاد :

حرم کی سرزمین میں پہنچ کر قدم قدم پر انسان اُن لوگوں کے آثار دیکھتا ہے جنہوں نے اللہ کی بندگی واطاعت میں اپنا سب کچھ قربان کیا' دنیا بھر سے لڑے' مصیبتیں اٹھائیں' جلاوطن ہوئے' ظلم پر ظلم سہے' مگر بالآخر اللہ کا کلمہ بلند کر کے چھوڑا' اور ہر اُس باطل قوت کا سر نیچا کر کے ہی دم لیا جو انسان سے اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی کرانا چاہتی تھی۔ یہ مقدس سرزمین حضرت ابراہیم علیہ السلام' حضرت حاجرہ سلامٌ علیہا اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی عظیم قربانیوں کی داستان سناتی ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جاں نثار صحابہ رضی اللہ عنہم کی بے مثال جدوجہد کی گواہ ہے۔ اِن آیاتِ بینات اور آثارِ متبرکہ کو دیکھ کر ایک خدا پرست آدمی عزم وہمت اور جہاد فی سبیل اللہ کا جو سبق لے سکتا ہے شاید کسی دوسری چیز سے نہیں لے سکتا۔

(۵) نوعِ انسانی کے لیے ایک عالمگیر وحدت واخوت :

حج کے موقع پر ایک عجیب نقشہ سامنے آتا ہے۔ دنیا کے کونے کونے سے اَن گنت قوموں اور بے شمار ملکوں کے لوگ متعدد راستوں سے ایک ہی مرکز کی طرف چلے آرہے ہیں۔ اُن کی صورتیں، رنگ اور زبانیں مختلف ہیں لیکن مرکز کے قریب ایک خاص حد پر پہنچتے ہی سب اپنے اپنے قومی لباس اُتار دیتے ہیں اور ایک ہی طرز کا سادہ سا لباس یعنی احرام باندھ لیتے ہیں۔ اب اِن سب کی زبانوں سے ایک ہی نعرہ بلند ہوتا ہے:

لَبَّیکَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیکَ، لَبَّیکَ لاَ شَرِیکَ لَکَ لَبَّیکَ !

بولنے کی زبانیں سب کی مختلف ہیں، مگر نعرہ سب کا ایک ہی ہے۔ جوں جوں مرکز قریب آتا جاتا ہے مختلف ملکوں کے قافلے ملتے چلے جاتے ہیں اور سب کے سب مل کر ایک ساتھ ایک ہی مرکز کے گرداگرد نمازیں پڑھتے ہیں، ایک امام کی پیروی کرتے ہیں، ایک اللہ اکبر کے اشارے پر اُٹھتے، بیٹھتے اور رکوع اور سجدہ کرتے ہیں اور ایک ہی قرآنِ عربی کو پڑھتے اور سنتے ہیں۔ یوں زبانوں اور قومیتوں اور وطنوں اور نسلوں کا اختلاف ٹوٹتا ہے اور یوں خدا پرستوں کی ایک عالمگیر جماعت بنتی ہے۔

حج کے دوران تمام قافلے ایک زبان ہو کر لبیک لبیک کے نعرے بلند کرتے ہوئے چلتے ہیں، ہر بلندی اور ہر پستی پر یہی نعرے لگتے ہیں، قافلوں کے ایک دوسرے سے ملنے کے وقت دونوں طرف سے یہی صدائیں اٹھتی ہیں، پھر جب سب منیٰ میں کیمپ لگاتے ہیں تو نمازوں کے وقت اور صبح کے تڑکے میں یہی آوازیں گونجتی ہیں جس سے ایک ایسی عجیب فضا پیدا ہو جاتی ہے جس کے نشے میں آدمی سرشار ہو کر اپنی خودی کو بھول جاتا ہے اور اِس لبیک کی کیفیت میں جذب ہو کر رہ جاتا ہے۔ پھر سب کا عرفات کی طرف کوچ کرنا اور وہاں ایک امام سے خطبہ سننا، پھر سب کا مُزدلفہ میں رات کی چھاؤنی ڈالنا، پھر سب کا ایک ساتھ منیٰ کی طرف پلٹنا، پھر سب کا متفق ہو کر جمرۂ عقبہ پر کنکریوں کی چاند ماری کرنا، پھر سب کا قربانیاں کرنا، پھر سب کا ایک ساتھ کعبے کی طرف پلٹ کر اِس ایک مرکز کا طواف کرنا، پھر سب کا ایک ساتھ صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرنا، پھر سب کا منیٰ میں لوٹ کر تین روز تک پڑاؤ کرنا اور جمرات پر رمی کرنا وحدتِ امت کی وہ مثالی تصویر پیش کرتا ہے جس کی نظیر دنیا میں ناپید ہے۔

دنیا بھر کی قوموں سے نکلے ہوئے لوگوں کا ایک مرکز پر اجتماع، یک دلی و یک جہتی کے

*

ساتھ، ہم خیالی وہم آہنگی کے ساتھ، پاکیزہ جذبات، مقاصد اور اعمال کے ساتھ، حقیقت میں اتنی بڑی نعمت ہے جو نوعِ انسانی کو اسلام کے سوا کسی نے نہیں دی۔ دنیا کی قومیں ایک دوسرے سے ملتی رہی ہیں، مگر کس طرح؟ میدانِ جنگ میں گلے کاٹنے کے لیے، صلح کانفرنسوں میں ملکوں کی تقسیم اور قوموں کے بٹوارے کے لیے، مجلس اقوام متحدہ میں تاکہ ہر قوم دوسری قوم کے خلاف دھوکے، فریب اور سازشوں کے جال پھیلائے اور دوسروں کے نقصان سے اپنا فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ تمام اقوام کے لوگوں کا صاف دلی کے ساتھ ملنا، نیک اخلاق اور پاکیزہ خیالات کے ساتھ ملنا، محبت اور خلوص کے ساتھ ملنا، قلبی و روحانی اتحاد کے ساتھ ملنا، خیالات، اعمال اور مقاصد کی یک جہتی کے ساتھ ملنا، پھر صرف اور صرف ایک ہی دفعہ مل کر نہ رہ جانا بلکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہر سال ایک مرکز پر اسی طرح اکٹھے ہوتے رہنا، کیا یہ نعمت اسلام کے سوا بنی نوع انسان کو اور کہیں ملتی ہے؟ دنیا میں امن قائم کرنے، قوموں کی دشمنیوں کو مٹانے اور لڑائی جھگڑوں کے بجائے محبت، دوستی اور برادری کی فضا پیدا کرنے کے لیے اس سے بہتر نسخہ کیا کسی اور نے تجویز کیا ہے؟ مولانا ابوالکلام آزاد اپنی کتاب ''ارکانِ اسلام'' میں لکھتے ہیں :

> ''موجودہ زمانے کی سب سے بڑی خصوصیت یہ بتلائی جاتی ہے کہ علوم و تمدن کی ترقی اور سیر و حرکت کے حیرت انگیز وسائل نے قوموں اور ملکوں کا تفرقہ دور کر دیا ہے۔ بحر و بر کے ڈانڈے مل گئے ہیں اور ساری دنیا ایسی ہو گئی ہے جیسے ایک مسلسل آبادی کے مختلف محلے یا حصے ہوتے ہیں۔ لیکن اس پر بھی ہم دیکھ رہے ہیں کہ قوموں اور ملکوں کے مکان کا تفرقہ جس قدر کم ہوتا جاتا ہے، دل اور دماغ کا تفرقہ اتنا ہی بڑھتا جاتا ہے۔ جس قدر تیزی سے بیسویں صدی کی موٹریں اور طیارے دوڑ رہے ہیں، اتنی ہی تیزی سے قوموں کے دل بھی ایک دوسرے سے برگشتہ ہو رہے ہیں۔ لیکن اب سے تیرہ سو برس پہلے جب دنیا موجودہ زمانے کے تمام وسائل سے محروم تھی، بحرِ احمر کے کنارے، ریگستان عرب کے وسط میں، حجاز کی چٹیل اور بے زراعت وادی کے اندر، ایک صدائے اجتماع بلند ہوئی اور نسلِ انسانی کے منتشر افراد کا ایک نیا گھرانہ آباد کیا گیا۔ انسانی اجتماع و یگانگت کی یہ پکار صرف اتنا ہی نہیں چاہتی تھی کہ ملکوں کی سرحدیں اور جغرافیہ کی حدیں ایک دوسرے سے قریب ہو جائیں بلکہ اس کا مقصد نسلِ انسانی کے بکھرے ہوئے دلوں اور برگشتہ روحوں کو ایک دوسرے سے جوڑ دینا تھا۔ حج کی عبادت نے ملکوں کو اکٹھا کر دیا، قوموں کو جوڑ دیا، نسل اور زبان و مکان کے سارے تفرقے دور کر دیئے، گورے کو کالے کے ساتھ اور بادشاہ کو فقیر بے نوا کے ساتھ ایک ہی مقام میں،

ایک ہی وضع ولباس میں' ایک ہی صورت و اعتقاد کے ساتھ' اِس طرح جمع کر دیا کہ انسانی گمراہی کے بنائے ہوئے سارے امتیازات مٹ گئے' انسانی اخوت ووحدت اپنی بےنظیر صورت میں بےنقاب ہوگئی''۔

مولانا آزاد جدہ سے ایک صاحب کو خط تحریر کرتے ہیں:

''آج کل بحرِ احمر کا یہ ساحلی مقام تمام کرۂ ارضی کے انسانوں کا مرکز بن گیا ہے۔ خشکی اور تری' دونوں راہوں سے قوموں اور ملکوں کے قافلے پہنچ رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جدہ کی زمین شق ہوگئی ہے اور انسانوں کے انبوہ اُگل رہی ہے۔ ایک دن میں نے مغرب کی نماز ساحل کی ریت پر ادا کی جہاں بعض رؤسائے جدہ نے کلب کی طرح ایک روزانہ اجتماع ''نادی الصلوٰۃ'' کے نام سے قائم کر رکھا ہے۔ نماز کے بعد جب میں لوٹا اور بازار کے قریب پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں' برطانوی نمائندہ اسٹاف کے چند انگریز کھڑے بازار کے نظارہ میں غرق ہیں۔ ان میں ایک شخص رابرٹس نامی تھے' جن سے میں ایک دو مرتبہ مل چکا تھا۔ میں نے اُن سے پوچھا۔ ''آپ کس چیز کے نظارہ میں اس قدر دلچسپی لے رہے ہیں؟'' اُنہوں نے کہا: ''دیکھو یہ ہندوستان کا گروہ ہے' یہ پانچ پست قد جاوی کھڑے ہیں' اُن کے ساتھ چین کے منگولین دکھائی دے رہے ہیں' دوسری طرف ایک ترکستانی کی سیاہ ٹوپی اور افغانی کی بڑی سی پگڑی ہے' اُن کے پیچھے ایک گروہ یمنی عربوں کا سرخ جبے پہنے ہوئے جا رہا ہے اور اُن کے ساتھ اقصائے افریقہ کا ایک جزائری بربر ہنس ہنس کر باتیں کر رہا ہے۔ تیسری طرف دو حبشی کھڑے ہیں اور ایک مصری طربوش اُن کے پیچھے نظر آ رہی ہے۔ اگر ان تمام قوموں کی آبادیاں جغرافیہ کے نقشے میں ڈھونڈی جائیں تو کیسے کیسے عظیم سمندر اور بےکنار صحرا اِن میں حائل نظر آئیں گے۔ لیکن یہاں اِن سب کو جمع کر دیا گیا ہے۔ سال کے اِس موسم میں خود بخود دنیا کے تمام گوشے اِس جگہ یکجا ہو جاتے ہیں۔ کیا آج دنیا کے کسی حصے میں بھی ایسا منظر نظر آ سکتا ہے؟ کیا اِس منظر سے بھی بڑھ کر کوئی منظر ہے جو انسانی اجتماع کی ایک عجیب وغریب قوت کا پتہ دے؟ میں سوچ رہا ہوں کہ کس کے ہاتھوں میں اِس رشتہ کا سرا ہے جس سے بحر و بر کے یہ تمام گوشے کھینچ لیے جا سکتے ہیں؟ اسلام کے ہاتھ میں! چھٹی صدی کے صحرائے عرب کا اسلام آج بھی انسانی اخوت کی سب سے بڑی زندہ قوت ہے!''

مضمون کے آخر میں مولانا آزاد اپنا تأثر اِن الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

*

3

''ایک ایسے وقت میں جب تمام دنیا نسلی تعصّبات کے شعلوں میں جل رہی ہے' مگر یہ دیکھو یہ دنیا کی تمام نسلیں کس طرح بھائیوں اور عزیزوں کی طرح ایک مقام پر جمع ہیں اور سب ایک ہی حالت' ایک ہی وضع' ایک ہی لباس' ایک ہی قطع' ایک ہی مقصد اور ایک ہی صدا کے ساتھ ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں؟ سب اللہ کو پکار رہے ہیں' سب اللہ ہی کے لیے حیران و سرگشتہ ہیں' سب کی عاجزی اور درماندگیاں اللہ ہی کے لیے ابھر آئی ہیں' سب کے اندر ایک ہی لگن اور ایک ہی ولولہ ہے' سب کے سامنے محبتوں اور چاہتوں کے لیے اور پرستشوں اور بندگیوں کے لیے ایک ہی محبوب و مطلوب ہے اور جبکہ تمام دنیا کا محورِ عمل' نفس و ابلیس ہے تو یہ سب صرف اللہ کے عشق و محبت میں خانہ ویراں ہو کر اور جنگلوں اور دریاؤں کو قطع کر کے دیوانوں اور بےخودوں کی طرح یہاں اکٹھے ہوئے ہیں! اُنہوں نے نہ صرف دنیا کے مختلف گوشوں کو چھوڑا' بلکہ دنیا کی خواہشات اور ولولوں سے بھی کنارہ کش ہو گئے''۔

(۶) مساواتِ انسانی کا عظیم مظہر :

بیت اللہ کی طرف آنے والے جتنے راستے ہیں' ان سب پر بیسیوں میل دور سے ایک ایک حد مقرر کر دی گئی ہے جسے میقات کہا جاتا ہے۔ اِس حد سے آگے بڑھنے سے پہلے سب لوگ اپنے اپنے لباس بدل کر احرام کا فقیرانہ لباس پہن لیتے ہیں' تاکہ سب امیر و غریب یکساں ہو جائیں' الگ الگ قوموں کے امتیازات مٹ جائیں' اور سب کے سب اللہ کے دربار میں ایک ہو کر' فقیر بن کر عاجزانہ شان کے ساتھ حاضر ہوں۔ بقول اقبال :ؔ

بندہ وصاحب و محتاج وغنی ایک ہوئے
تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

مسجد حرام کے حوالے سے ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ الَّذِیْ جَعَلْنٰہُ لِلنَّاسِ سَوَآءَ نِ الْعَاکِفُ فِیْہِ وَالْبَادِ ط﴾

(الحج:۲۵)

''مسجد الحرام کو ہم نے تمام لوگوں کے لیے برابر کر دیا ہے' خواہ کوئی وہاں رہنے والا ہو' خواہ کوئی باہر سے آنے والا ہو''۔

اللہ تعالیٰ نے دنیا کو ایک ایسا مرکز دیا ہے جس کی تعریف یہ ہے کہ ﴿سَوَآءَ نِ الْعَاکِفُ فِیْہِ وَالْبَادِ﴾ یعنی وہاں اُن تمام انسانوں کے حقوق بالکل برابر ہیں جو اللہ کی بادشاہی

اور حضرت محمد ﷺ کی رہنمائی تسلیم کر کے اسلام کی برادری میں داخل ہو جائیں، خواہ کوئی شخص امریکہ کا رہنے والا ہو یا ہندوستان کا، چین کا ہو یا افریقہ کا۔ اگر کوئی شخص مسلمان ہو جائے تو مکہ کی زمین پر اُس کے وہی حقوق ہیں جو خود مکہ والوں کے ہیں۔ پورے حرم کے علاقے کی حیثیت گویا مسجد کی سی ہے۔ جو شخص مسجد میں جا کر کسی جگہ اپنا ڈیرہ جما دے وہ جگہ اُسی کی ہے جب تک وہ وہاں بیٹھا رہے۔ البتہ وہ اگر تمام عمر وہاں بیٹھا رہا ہو تب بھی اُسے یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ یہ جگہ میری ملک ہے۔ نہ وہ اُس کو بیچ سکتا ہے اور نہ اُس کا کرایہ وصول کر سکتا ہے۔ یہاں تک کہ جب وہ شخص اُس جگہ سے اٹھ جائے تو دوسرے کو بھی وہاں ڈیرہ جمانے کا ویسا ہی حق ہے جیسا کہ اُس کو تھا۔ بالکل یہی حال پورے مکہ کے حرم کا ہے۔ مَكَّةُ مُنَاخٌ لِّمَنْ سَبَقَ یعنی جو شخص اس شہر میں کسی جگہ آ کر پہلے اُتر جائے وہ جگہ اُسی کی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے وہاں کے لوگوں کو حکم دیا تھا کہ اپنے مکانات کے گرد صحنوں پر دروازے نہ لگاؤ، تاکہ جو چاہے تمہارے صحن میں آ کر ٹھہر سکے۔ بعض فقہا نے تو یہاں تک کہا ہے کہ شہر مکہ کے مکانات کسی کی ملکیت نہیں، وہاں کے مکانوں کا کرایہ لینا جائز نہیں اور نہ وہ مکانات وراثت میں منتقل ہو سکتے ہیں۔

(۷) اجتماعی تزکیہ :

حج کی نیت کے ساتھ ہی انسان کو سابقہ گناہوں کے حوالے سے توبہ واستغفار، آئندہ کے لیے گناہوں سے پرہیز اور نیکیوں کی طرف میلان کی نعمتیں حاصل ہو جاتی ہیں۔ اُسے اللہ سے لو لگانے اور بندوں کے ساتھ حسنِ اخلاق سے پیش آنے میں ایک سرور محسوس ہوتا ہے۔ وہ اپنے عزیزوں، دوستوں اور ہر قسم کے متعلقین سے اِس طرح اپنے معاملات صاف کرنا شروع کرتا ہے کہ گویا اب یہ وہ پہلا سا شخص نہیں رہا۔ اللہ کی طرف سے حج کے بلاوے اور توفیق نے اُس کی ایمانی و عملی کیفیات کو ایسی جلا بخشی ہے کہ وہ اپنے تمام معاملات میں بالکل ہی بدل گیا ہے۔ حاجی کی اِس حالت و کیفیت کے نیک اثرات تمام متعلقین پر پڑتے ہیں۔ اِس طرح ہر سال دنیا کے مختلف حصوں میں لاکھوں حاجیوں کے پاکیزہ جذبات کروڑوں مسلمانوں کو متأثر کرتے ہیں۔ پھر حاجیوں کے قافلے جہاں جہاں سے گزرتے ہیں، وہاں اُن کو دیکھ کر، اُن سے مل کر، اُن کی لَبَّيْكَ اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ کی صدائیں سن کر کتنوں کے دل گرماتے ہیں۔ کتنوں کی توجہ اللہ کی طرف اور اللہ کے گھر کی طرف پھر جاتی ہے۔ کتنوں کی سوئی ہوئی روح میں حج کے شوق سے حرکت پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر جب یہ لوگ بیت اللہ سے فیوض و برکات لے کر ایمان افروز

*

جذبات کے ساتھ اپنی اپنی بستیوں کی طرف لوٹتے ہیں اور لوگ اُن سے ملاقات کرتے ہیں تو اُن کی زبانِ حال اور زبانِ قال سے اللہ کے گھر کا ذکر سن کر کتنے دلوں میں دینی جذبات تازہ ہوجاتے ہیں۔ پھر اگر یہ لاکھوں حج کرنے والے اپنی کیفیات کو دوام دینے کی کوشش کریں اور آئندہ کے لیے اپنے جملہ معاملات کو حرام اور منکرات سے پاک کرلیں تو معاشرے میں کیسی خوشگوار تبدیلی برپا ہوجائے۔ اِسی طرح ہر سال اگر لاکھوں حاجی حرم سے توبہ اور تقویٰ کا تحفہ لے آئیں تو ہمارا معاشرہ رفتہ رفتہ ہرطرح کی بدامنی، ظلم واستحصال اور اخلاقی برائیوں سے پاک ہوجائے۔ افسوس کہ حاجیوں کی اکثریت حرم سے زم زم کا تحفہ تو لاتی ہے لیکن منکرات کو چھوڑنے اور فرائض کو ادا کرنے کا مصمم عزم لے کر نہیں آتی، بقول اقبال :ـ

زائرانِ کعبہ سے اقبال یہ پوچھے کوئی
کیا حرم کا تحفہ زم زم کے سوا کچھ بھی نہیں؟

یہ ہے وہ حج جس کے متعلق فرمایا گیا تھا کہ اسے کرکے دیکھو، اس میں تمہارے لیے کتنے منافع ہیں۔ ہمارے لیے ممکن نہیں کہ ہم اِس عظیم عبادت کے سارے منافع سمجھ سکیں، تاہم اس کے فائدوں کا مذکورہ بالا مختصر خاکہ اِس بات پر شاہد ہے کہ حج کی عبادت اللہ کی کیسی عظیم نعمت ہے۔ البتہ ہمارا حال یہ ہے کہ ہم نے جہاں اللہ کی بے شمار نعمتوں کی ناقدری کی وہیں حج جیسی نعمت کو بھی محض ایک رسم بنا دیا۔ اِسے گناہوں کی معافی کا ذریعہ تو سمجھا لیکن اِسے گناہوں سے مستقل اجتناب کا ذریعہ نہیں بننے دیا۔ اقبال کہتے ہیں:ـ

رگوں میں وہ لہو باقی نہیں ہے
وہ دل، وہ آرزو باقی نہیں ہے
نماز و روزہ و قربانی و حج
یہ سب باقی ہیں، تو باقی نہیں ہے!

مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ حج کے حوالے سے ہماری اکثریت کے طرزِ عمل پر مرثیہ اِن الفاظ میں کہتے ہیں :

''تم دیکھتے ہو کہ ہر سال ہزار ہا زائرین مرکزِ اسلام کی طرف جاتے ہیں اور حج سے مشرف ہوکر پلٹتے ہیں، مگر نہ جاتے وقت ہی اُن پر وہ اصلی کیفیت طاری ہوتی ہے جو ایک مسافرِ حرم میں ہونی چاہیے، نہ وہاں سے واپس آکر ہی اُن میں کوئی اثر حج کا پایا جاتا ہے، اور نہ اِس سفر کے دوران میں وہ اِن آبادیوں کے مسلمانوں اور غیر مسلموں پر

اپنے اخلاق کا کوئی اچھا نقش بٹھاتے ہیں جن پر سے اُن کا گزر ہوتا ہے۔ بلکہ اِس کے برعکس اُن میں زیادہ تر وہ لوگ شامل ہوتے ہیں جو اَخلاقی پستی کی نمائش کر کے اسلام کی عزت کو بٹہ لگاتے ہیں۔ اُن کی زندگی کو دیکھ کر بجائے اِس کے کہ دین کی بزرگی کا سکہ غیروں پر جمے، خود اپنوں کی نگاہوں میں بھی وہ بے وقعت ہو جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ آج خود ہماری اپنی قوم کے بہت سے نوجوان ہم سے پوچھتے ہیں کہ ذرا اِس حج کا فائدہ تو ہمیں سمجھاؤ۔ حالانکہ یہ حج وہ چیز تھی کہ اگر اِسے اس کی اصلی شان کے ساتھ ادا کیا جاتا تو کافر تک اس کے فائدوں کو علانیہ دیکھ کر ایمان لے آتے۔ کسی تحریک کے ہزاروں لاکھوں ممبر ہر سال دنیا کے ہر حصے سے کھنچ کر ایک جگہ جمع ہوں اور پھر اپنے اپنے ملکوں کو واپس جائیں، ملک ملک اور شہر شہر سے گزرتے ہوئے اپنی پاکیزہ زندگی، پاکیزہ خیالات اور پاکیزہ اخلاق کا اظہار کرتے جائیں، جہاں جہاں ٹھہریں اور جہاں سے گزریں وہاں اپنی تحریک کے اصولوں کا نہ صرف زبان سے پرچار کریں بلکہ اپنی عملی زندگی سے اُن کا پورا پورا مظاہرہ بھی کر دیں اور یہ سلسلہ دس بیس برس نہیں بلکہ صدیوں تک سال بسال چلتا رہے، بھلا غور تو کیجئے کہ یہ بھی کوئی ایسی چیز تھی کہ اِس کے فائدے پوچھنے کی کسی کو ضرورت پیش آتی؟ خدا کی قسم! اگر یہ کام صحیح طریقہ پر ہوتا تو اندھے اِس کے فائدے دیکھتے اور بہرے اس کے فائدے سن لیتے۔ ہر سال کا حج کروڑوں مسلمانوں کو نیک بناتا، ہزاروں غیر مسلموں کو اسلام کے دائرے میں کھینچ لاتا اور لاکھوں غیر مسلموں کے دلوں پر اسلام کی بزرگی کا سکہ بٹھا دیتا۔ مگر بُرا ہو جہالت کا، جاہلوں کے ہاتھ پڑ کر کتنی بیش قیمت چیز کس بُری طرح ضائع ہو رہی ہے"۔

کسی بھی عبادت کی قبولیت کی علامت یہ ہے کہ اُس کے پائیدار اثرات انسان کی زندگی پر پڑیں اور زندگی کا رخ درست ہو جائے۔ اگر حج سے کسی کی زندگی کا رُخ بدل گیا یعنی اُس نے حرام کمائی کی ہر صورت، بے حیائی اور بے پردگی اور دیگر گناہوں سے خود کو بچا لیا اور اپنی تمام دینی ذمہ داریاں ادا کرنی شروع کر دیں تو یہ حج کے قبول ہونے کی دلیل ہے۔ اللہ تعالیٰ نہ صرف ہمیں اپنے محترم گھر کے حج کی سعادت نصیب فرمائے بلکہ اِس کے تمام ثمرات عطا فرمائے، اِسے ہماری زندگیوں میں پاکیزہ تبدیلی کا پیش خیمہ بنائے اور ہمیں مال و جان سے اللہ کی ہر پکار پر لبیک کہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

❁ ❁ ❁

*

بحث و نظر

اسلام اور جمہوریت

کیا نظامِ جمہوریت اسلام کے ساتھ ہم آہنگ ہے؟

شوکت اللہ شاکر

جمہوریت اپنے اصل عربی مفہوم کے اعتبار سے کوئی بری چیز نہیں ہے۔ ابن منظور افریقی لسان العرب میں لکھتے ہیں:

اَلْجَمْهُوْرُ هِيَ الرَّمْلَةُ الْمُشْرَفَةُ عَلٰى مَاحَوْلَهَا الْمُجْتَمِعَةُ الرَّمْلُ الْكَثِيْرُ الْمُتَرَاكِمُ الْوَاسِعُ. وَالْجَمْهُوْرَةُ الْاَرْضُ الْمُشْرَفَةُ عَلٰى مَا حَوْلَهَا وَجَمْهُوْرُ كُلِّ شَيْءٍ مُعْظَمُهُ وَجَمْهُوْرُ النَّاسِ جُلُّهُمْ

''جمہور ریت کے اس ڈھیر کو کہتے ہیں جو اردگرد کی زمین سے بلند اور مجتمع ہو' اور بہت سی تہہ بہ تہہ ریت کے وسیع میدان کو بھی جمہور کہا جاتا ہے۔ 'جمهورة' وہ زمین ہوتی ہے جو اردگرد کی زمین سے بلند ہو۔ ہر چیز کے بڑے حصے کو جمہور کہا جاتا ہے۔ 'جمهور الناس' سے مراد ہے لوگوں کے ممتاز اور نمایاں افراد یا ان کی اکثریت۔''

حدیث' فقہ اور لغت کی کتابوں میں لفظِ جمہور اسی لغوی مفہوم میں بار بار آتا ہے۔ یعنی اکثریت یا نمایاں اور بلند مرتبہ افراد۔ اور اس مفہوم کے اعتبار سے اس کے استعمال میں کوئی شرعی قباحت نہیں ہے۔ اسلامی ریاست کا سربراہ جمہور الناس یا ان کے نمائندوں (اهل الحلّ والعقد) کا منتخب کردہ اور معتمد علیہ ہونا ضروری ہے اور اس لحاظ سے اسلامی نظام حکومت بھی جمہوری اور شورائی نظام ہے۔ لیکن زیرِ بحث لفظ جمہوریت یا جمہور نہیں بلکہ ''ڈیموکریسی'' (Democracy) ہے۔ اہل مغرب نے جمہوریت کا تصور عربی ڈکشنری سے نہیں لیا ہے بلکہ یونانی لفظ ''ڈیموکریسی'' سے لیا ہے' جس کے معنی ہیں ''عوام کی حکومت''۔

''جمہوریت'' کی بہت سی تعریفیں کی گئی ہیں جن میں سے ابراہام لنکن' ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے سولہویں صدر' کی تعریف زیادہ جامع' واضح اور عام فہم ہے اور وہ یہ ہے:

☆ ''بحث و نظر'' کے عنوان کے تحت شائع ہونے والی تحریروں سے ادارے کا اتفاق ضروری نہیں۔

"Government of the people, by the people, for the people."

یعنی ''عوام کی حکومت ——— عوام کے ذریعے ——— عوام کے لیے''۔

اس نظامِ سیاست میں عوام کو یہ ذہن نشین کرایا جاتا ہے کہ یہ حکومت ان کی اپنی ہی ہے اور ان پر کسی دوسری حاکمیت کا دباؤ نہیں ہے۔ اور اس کا طریق کار یہ ہے کہ عوام میں سے ہر بالغ مرد و عورت اپنا نمائندہ منتخب کرنے کا حق رکھتا ہے تاکہ یہ منتخب نمائندے ان پر حکومت کریں اور ان کے لیے قانون بنائیں۔

تمام تمدنی مسائل انسانوں کے باہمی روابط سے پیدا ہوتے ہیں اور ان روابط کو جو چیز منصفانہ طور پر متعین کرتی ہے وہ قانون ہے۔ مگر قانون کے متعلق یہ بنیادی سوالات جنم لیتے ہیں کہ قانون کیا ہو اور قانون کون دے؟ وہ کون ہو جس کی منظوری سے کسی قانون کو قانون کا درجہ عطا کیا جائے؟ مگر حیرت انگیز بات یہ ہے کہ آج تک انسان اپنی زندگی کا قانون دریافت نہ کر سکا اور ایک معیاری قانون کی تلاش میں کبھی ایک انتہا پر پہنچا اور کبھی دوسری انتہا پر۔ اگر حاکم کو بحیثیتِ حاکم یہ مقام دیں تو اس کی دلیل کیا ہے کہ ایک یا چند اشخاص کو دوسرے تمام لوگوں کے مقابلے میں یہ امتیازی حق دے دیا جائے؟ اور نہ ہی یہ عملاً مفید ہے کہ فردِ واحد کو یہ اختیار دیا جائے کہ وہ جو چاہے قانون بنائے اور جس طرح چاہے نافذ کرے۔ اور اگر معاشرہ اور اجتماع کو قانون ساز قرار دیں تو یہ اور زیادہ مہمل بات ہے، کیونکہ معاشرہ بحیثیت مجموعی وہ علم اور عقل ہی نہیں رکھتا جو قانون سازی کے لیے ضروری ہے۔ قانون بنانے کے لیے بہت سی مہارتوں اور واقفیتوں کی ضرورت ہے جس کی نہ تو عام لوگوں میں صلاحیت ہوتی ہے اور نہ اُن کو اتنا موقع ہوتا ہے کہ وہ ان میں درک حاصل کر سکیں۔

موجودہ زمانے میں اس مسئلے کا حل یہ نکالا گیا کہ پوری آبادی کے عاقل اور بالغ افراد اپنے نمائندے منتخب کریں اور یہ منتخب لوگ اجتماع کے نمائندے کی حیثیت سے اجتماع کے لیے قانون بنائیں۔ مگر اس اصول کی غیر معقولیت اسی سے ظاہر ہے کہ ۵۱ فیصدی کو صرف دو عدد کی اکثریت کی بنا پر یہ حق مل جاتا ہے کہ وہ ۴۹ فیصدی کی نام نہاد اقلیت پر حکمرانی کریں۔ اس طریقے کے اندر اتنے خلا ہیں کہ عموماً ۵۱ فیصدی کی اکثریت بھی حاصل نہیں ہوتی اور مطلق اقلیت کو یہ موقع مل جاتا ہے کہ وہ اکثریت کے اوپر حکومت بنائے۔

اسلام اس کا جواب یہ دیتا ہے کہ قانون کا ماخذ اللہ ہے جس نے زمین و آسمان کا اور ساری طبیعی دنیا کا قانون مقرر کیا ہے، اسی کو حق ہے کہ وہ انسان کے تمدن و معاشرت کا قانون وضع کرے۔

*

اس کے سوا کوئی بھی نہیں ہے جس کو یہ حیثیت دی جا سکے۔ یہ جواب اتنا سادہ اور معقول ہے کہ وہ خود ہی بول رہا ہے کہ اس کے سوا اس مسئلہ کا کوئی اور جواب ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ جواب اس سوال پر اسی طرح بالکل راست آ رہا ہے جیسے کوئی ڈھکن غلط بوتلوں پر بیٹھ نہ رہا ہو اور جیسے ہی اسے اس کے اصل مقام پر لایا جائے وہ ٹھیک ٹھیک اس پر بیٹھ جائے۔

جمہوریت دراصل بادشاہت اور پاپائیت کے ردّعمل میں وجود میں آئی ہے۔ جس طرح سوشلزم سرمایہ داری کی دوسری انتہا ہے اسی طرح موجودہ جمہوریت شخصی اور استبدادی حکومت کی دوسری انتہا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جب کوئی چیز اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے تو فوائد کے بجائے اس کے مضر اثرات زیادہ نمایاں ہونے لگتے ہیں' جبکہ اسلام نے ہر معاملہ میں اعتدال کی راہ اختیار کرنے کی تعلیم دی ہے اور اُمتِ مسلمہ کو ''اُمتِ وَسط'' قرار دیا گیا ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے:

﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ......﴾ (البقرة: ۱۴۳)

''اور اسی طرح ہم نے تمہیں ایک متوسط اُمت بنایا تا کہ تم لوگوں پر گواہ بن سکو......''

اور نبی اکرم ﷺ کا فرمان ہے:

((خَيْرُ الْاُمُوْرِ اَوْسَطُهَا)) (۱) ''ہر معاملہ میں اعتدال کی راہ ہی بہتر ہے''۔

تمام مسلمان اس بات پر متفق ہیں کہ اسلام مکمل ضابطۂ حیات ہے' لہٰذا ہمیں سیاست' معیشت اور معاشرت وغیرہ کے لیے دوسرے نظاموں سے کچھ مستعار لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ بالفاظِ دیگر اگر ہمارا دین فی الواقع سوشلزم اور مغربی جمہوریت کا محتاج ہے تو پھر ہمیں کھلے دل سے یہ اعتراف کر لینا چاہیے کہ ہمارا دین نامکمل ہے۔

سید قطب شہید لکھتے ہیں:

''بعض لوگ اسلام کے سیاسی نظام کا تعلق اور مشابہت انسان کے وضع کردہ قدیم و جدید نظاموں کے ساتھ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں' یہ ان کا احساسِ کمتری اور ان کی شکست خوردہ ذہنیت ہے۔ اسلام کسی انسانی نظام کا مقلد اور محتاج نہیں ہے' بلکہ اسلام اپنا منفرد اور ممتاز نظام رکھتا ہے اور انسانیت کے سامنے کامل علاج پیش کرتا ہے (بَلِ اخْتَارَ طَرِيْقَهٗ مُتَفَرِّدًا فَذًّا وَّقَدَّمَ الْاِنْسَانِيَةَ عِلَاجًا كَامِلًا)''۔

اسلام کے نظامِ سیاست ''نظامِ خلافت'' کی امتیازی خصوصیات ہیں اور یہ خصوصیات دیگر نظام ہائے سیاست میں نہیں پائی جاتیں۔ تاہم نظامِ خلافت کے چند لازمی اصول ایسے ہیں جو کسی نہ کسی شکل میں اور کسی حد تک دوسرے نظاموں میں بھی پائے جاتے ہیں اور ان کی وجہ سے بعض لوگ

مغالطے کا شکار ہو کر ان نظاموں کو اسلامی کہنا شروع کر دیتے ہیں۔ مثلاً مغربی لادین اور مشرکانہ نظامِ جمہوریت میں اسلام کے چند اصول وصفات کی جھلک دیکھ کر بعض جمہوریت نواز حضرات اس کے ساتھ 'اسلامی' کا سابقہ لگا کر اور ''اسلامی جمہوریت'' کہہ کر اسے مشرف بہ اسلام کرنے کی بے جا اور ناکام سعی کرتے ہیں۔ حالانکہ جمہوریت اپنے اساسی اصولوں (حاکمیت عوام' مذہب اور سیاست کی مکمل علیحدگی' بے قید اور بے لگام آزادی' سرمایہ داری' مادہ پرستی' قوم پرستی اور پارٹی سسٹم وغیرہ) کے لحاظ سے اسلام کی ضد ہے۔

اسلامی تعلیمات کی رو سے حاکمیت صرف اللہ کی ہے ﴿اِنِ الۡحُکۡمُ اِلَّا لِلّٰہِ﴾ جبکہ جمہوریت میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کے بجائے عوام کی حاکمیت ایک اساسی اصول کے طور پر موجود ہے۔ اسلام میں قانونی مقتدرِ اعلیٰ صرف اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہے' جبکہ دوسرے نظاموں میں مقتدرِ اعلیٰ یا تو کوئی فرد ہوتا ہے یا ادارہ۔

جمہوری طرزِ انتخاب میں ہر چھوٹے بڑے' اچھے بُرے' عالم وجاہل' نیک اور بدکردار کے ووٹ یا رائے کی قیمت یکساں ہے۔ یعنی ہر بالغ......مرد ہو یا عورت......کی رائے اور فہم و فراست' عقل ودانش یکساں قرار دی گئی ہے اور اسے سیاسی مساوات کا نام دیا گیا ہے۔ یہ نظریہ بھی قرآنی آیات کے صریح خلاف ہے۔ مثلاً:

﴿اَفَمَنۡ کَانَ مُؤۡمِنًا کَمَنۡ کَانَ فَاسِقًا ؕ لَا یَسۡتَوٗنَ ﴿۱۸﴾﴾ (حٰمٓ السجدة)

''بھلا جو مؤمن ہے وہ اُس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو نافرمان ہو؟ دونوں برابر نہیں ہو سکتے''۔

﴿قُلۡ ہَلۡ یَسۡتَوِی الَّذِیۡنَ یَعۡلَمُوۡنَ وَ الَّذِیۡنَ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ؕ﴾ (الزُّمَر:۹)

''کہہ دیجیے کیا عالم اور جاہل برابر ہو سکتے ہیں''۔

﴿قُلۡ ہَلۡ یَسۡتَوِی الۡاَعۡمٰی وَ الۡبَصِیۡرُ﴾ (الرّعد:۱۶)

''کہہ دیجیے کیا اندھا اور آنکھوں والا برابر ہیں؟''

﴿قُلۡ لَّا یَسۡتَوِی الۡخَبِیۡثُ وَ الطَّیِّبُ وَ لَوۡ اَعۡجَبَکَ کَثۡرَۃُ الۡخَبِیۡثِ﴾

(المائدة:۱۰۰)

''کہہ دیجیے ناپاک اور پاک برابر نہیں ہو سکتے' خواہ ناپاک (چیزوں/ لوگوں) کی کثرت آپ کو بھلی معلوم ہو''۔

نبی اکرم ﷺ نے جنگ بدر کے قیدیوں کے متعلق صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ کیا کہ ان کے

*

ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی رائے تھی کہ انہیں فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے اور اکثر صحابہؓ حضرت ابوبکرؓ کے ہمنوا تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس رائے سے اختلاف کیا اور کہا کہ میری رائے یہ ہے کہ ان سب کو تہ تیغ کیا جائے۔ چند صحابہؓ اس رائے کے بھی ہمنوا تھے۔ خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے بھی وہی تھی جو حضرت ابوبکرؓ کی تھی' لیکن اس کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کو مخاطب کر کے فرمایا: ((**لَوِ اجْتَمَعْتُمَا فِیْ مَشْوَرَةٍ مَا خَالَفْتُکُمَا**))[۲] یعنی ''اگر تم دونوں اس رائے پر متفق ہو جاتے تو میں اس کے خلاف نہ کرتا۔''

اس سے واضح ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں ان دو اصحابؓ کی رائے باقی صحابہؓ کے مقابلہ میں زیادہ قدر و قیمت رکھتی تھی۔

جمہوریت میں کثرتِ رائے پر فیصلہ کر دیا جاتا ہے جبکہ قرآن کریم میں تقریباً ۹۱ آیات ایسی ہیں جن میں لوگوں کی اکثریت کو ظالم' فاسق' جاہل' مشرک وغیرہ قرار دیا گیا ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو اکثریت کے تتبع سے سختی سے منع کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوا:

﴿**وَاِنْ تُطِعْ اَکْثَرَ مَنْ فِی الْاَرْضِ یُضِلُّوْکَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ**﴾ (الانعام :۱۱۶)

''اے نبی! اگر آپ لوگوں کی اکثریت کے پیچھے لگیں گے تو وہ آپ کو اللہ کی راہ سے بہکا دیں گے۔''

اس آیت نے معاشرہ کی اکثریت کو حق رائے دہی سے خارج قرار دیا ہے۔

اب اگر عقلی لحاظ سے دیکھا جائے تو بھی ہر بالغ کے حق رائے دہی کا اصول باطل ثابت ہوتا ہے۔ اگر ہم اپنے کسی ذاتی معاملہ میں مشورہ کرنا چاہیں تو ہر کس و ناکس سے رائے نہیں لیتے بلکہ صرف اُس شخص کو مشورہ کا اہل سمجھتے ہیں جو معاملہ فہم اور سمجھدار ہو اور اس معاملہ میں سوجھ بوجھ یا تجربہ رکھتا ہو۔ اور یہ تو ظاہر ہے کہ کسی بھی معاشرہ میں ذی شعور اور دانش مند طبقہ کی تعداد قلیل ہی ہوا کرتی ہے اور یہی لوگ فی الواقع رائے دینے کے اہل ہوتے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿**اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰی اَھْلِھَا**......﴾ (النساء:۵۸)

''اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے اہل کے حوالے کرو......''

اب اگر کسی رائے دہندہ کو یہ شعور ہی نہ ہو کہ نمائندہ کی اہلیت کیا ہے تو اسے رائے دینے کا حق کیونکر دیا جا سکتا ہے؟

حق بالغ رائے دہی کے جواز میں مذکورہ آیت (النساء:۵۸) سے استدلال کیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس حکم میں نمائندہ پر تو پابندی ہے کہ وہ ووٹ کا اہل ہو لیکن ووٹر پر عمل صالح کی کوئی

پابندی نہیں۔ پھر اس حکم عام کو کس رو سے مقید کیا جاتا ہے؟ علاوہ ازیں ہمارے پاس کون سا ایسا معیار ہے کہ ہم لوگوں کے اندرونی حالات کا پتا لگاتے پھریں کہ کون صالح ہے اور کون غیر صالح؟ جبکہ قرآن کریم میں یہ بھی واضح حکم ہے کہ: ﴿وَلَا تَجَسَّسُوْا﴾ (الحُجُرٰت:۱۲) ''اور کسی کا بھید نہ ٹٹولو۔''

اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن کریم میں ایسے بے شمار احکامات موجود ہیں جن میں صیغہ جمع حاضر استعمال ہوا ہے، حکم عام ہے لیکن اس کا اطلاق صرف اس کے اہل افراد پر ہوتا ہے۔ مثلاً قرآن کریم میں ہے:

﴿وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا......﴾ (المائدة:۳۸)

''اور جو چوری کرے، مرد ہو یا عورت، ان کے ہاتھ کاٹ ڈالو......''

مذکورہ آیت میں ہاتھ کاٹنے کا حکم عام ہے لیکن اس کے مخاطب عمال حکومت ہی ہو سکتے ہیں جو سزا دینے کے اہل ہیں۔ اب اگر اس حکم کو عام سمجھ کر عام لوگ بھی یہ فریضہ سرانجام دینے لگیں تو جو حشر ہوگا، اس کا آپ اندازہ کر سکتے ہیں۔

اسی طرح ﴿وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ﴾ کا حکم عام ہے اور قرآن کریم میں سینکڑوں مرتبہ آیا ہے، لیکن اس کے مکلّف صرف وہ لوگ ہیں جو زکوٰۃ دینے کے اہل یا صاحبِ نصاب ہیں۔

شریعت میں ووٹر کی اہلیت کے لیے چند قیود اور پابندیاں لگائی گئی ہیں۔ پہلی پابندی تو یہ ہے کہ وہ مسلمان ہو، کیونکہ آیتِ کریمہ میں مخاطب مسلمان ہیں، کسی نام نہاد اسلامی ریاست کے عوام نہیں۔ اور مسلمان کی قانونی تعریف یہ ہے کہ وہ کم از کم نماز اور روزہ کا پابند ہو، ورنہ وہ اسلامی ریاست میں حقوقِ شہریت کا مجاز نہیں۔ فرمانِ نبوی ﷺ ہے:

((اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰى يَشْهَدُوْا اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰهِ وَيُقِيْمُوا الصَّلَاةَ وَيُؤْتُوا الزَّكَاةَ، فَاِذَا فَعَلُوْا ذٰلِكَ عَصَمُوْا مِنِّيْ دِمَاءَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ اِلَّا بِحَقِّ الْاِسْلَامِ وَحِسَابُهُمْ عَلَى اللّٰهِ))[۳]

''مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے جنگ کروں یہاں تک کہ وہ لا الٰہ الاّ اللہ محمدٌ رسول اللہ کی شہادت دیں، نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں۔ اگر وہ ایسا کریں تو ان کی جانیں اور مال محفوظ ہو جائیں گے، اِلّا یہ کہ وہ اسلام کے کسی حق کے تحت اس حفاظت سے محروم رہیں، اور ان کے باطن کا حساب اللہ پر ہے۔''

ووٹ جیسے ایک مقدس امانت ہے، ویسے ہی ایک شہادت بھی ہے کہ ووٹر فی الواقع اس

*

نمائندے کو نمائندگی کا اہل تر سمجھتا ہے جسے وہ ووٹ دے رہا ہے۔لہٰذا جس شخص کی شہادتِ اسلام نا قابل قبول قرار دیتا ہے اس کو ووٹ دینے کا بھی حق نہیں پہنچتا۔ایسے لوگ درج ذیل ہیں:

(۱) جس پر حدِ قذف جاری ہو چکی ہو۔ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا﴾ (النور:٤)

''اور جو لوگ پرہیز گار عورتوں کو بدکاری کا عیب لگائیں اور اس پر چار گواہ نہ لائیں تو ان کو اسّی دُرّے مارو اور کبھی ان کی شہادت قبول نہ کرو۔''

(۲) جھوٹی گواہی دینے والے لوگ جن کی جھوٹی گواہی ثابت ہو چکی ہو۔قرآن کریم میں مؤمن کی صفات میں سے ایک یہ بھی ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ......﴾(الفرقان:۷۲)

''اور جو لوگ جھوٹی گواہی نہیں دیتے......''

جھوٹی گواہی دینا گناہ کبیرہ ہے اور قابل تعزیر جرم ہے۔نبی اکرمﷺ سے پوچھا گیا کہ کبیرہ گناہ کیا کیا ہیں؟ آپﷺ نے فرمایا:

((اَلْاِشْرَاکُ بِاللهِ وَعُقُوْقُ الْوَالِدَيْنِ وَقَتْلُ النَّفْسِ وَشَهَادَةُ الزُّوْرِ))[4]

''اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنا، والدین کی نافرمانی، کسی کو قتل کرنا اور جھوٹی گواہی دینا''۔

(۳) فاسق کی شہادت قبول نہیں کرنی چاہیے۔ارشادِ ربانی ہے:

﴿يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْا....﴾(الحجرات:٦)

''اے مؤمنو! اگر کوئی بدکردار تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو خوب تحقیق کر لیا کرو......''

انہی نصوص کی راہنمائی میں فقہائے اسلام نے درج ذیل قسم کے اشخاص کی گواہی نا قابل قبول قرار دی ہے:

(۱) نماز روزے کا عمداً تارک
(۲) یتیم کا مال کھانے والا
(۳) زانی، زانیہ
(۴) فعل قومِ لوطؑ کا مرتکب
(۵) جس پر حدِ قذف نافذ ہو چکی ہو
(۶) چور، ڈاکو
(۷) ماں باپ کی حق تلفی کرنے والا
(۸) خائن، خائنہ

جبکہ بعض فقہاء کے نزدیک ان کے علاوہ مخنث، عادی شرابی، پیشہ ور مغنی، مسخرہ اور رقاص، تارکِ جمعہ و جماعت، بلا وجہ شرعی ہجو کہنے والے شاعر، ستر کھول کر حمام میں داخل ہونے والے، سود خور، چوسر اور

شطرنج کے کھیل میں مصروف رہ کر نماز قضا کرنے والے اور سلف صالحین کو برملا بُرا بھلا کہنے والے کی شہادت معتبر نہیں۔

اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ ہمارے پاس وہ کون سا معیار ہے جس سے ہم صالح اور غیر صالح کی تمیز کر سکیں۔ تو اس کے جواب کے لیے ہمیں اپنے محلے کی مسجد سے رابطہ قائم کرنا چاہیے' یہ مسئلہ خود بخود حل ہو جائے گا۔ وہاں ہمیں نماز ادا کرنے والوں' زکوٰۃ ادا کرنے والوں' چوروں' ڈاکوؤں' خائنوں اور فاسقوں سب کا پتہ چل جائے گا۔ پھر بھی اگر کچھ غلطی رہ جائے تو یہ تکلیف مالا یطاق ہے۔

حق بالغ رائے دہی کے اثبات میں اکثر آیۂ استخلاف بھی پیش کی جاتی ہے:

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِی الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ﴾(النور:۵۵)

''اللہ نے وعدہ فرمایا ہے تم میں سے ان لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں کہ وہ ان کو زمین میں خلیفہ بنائے گا جس طرح ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کو بنا چکا ہے۔''

اس آیت کریمہ کی مختلف تعبیریں مولانا مودودی مرحوم کی زبان سے سنیے۔ ایک طرف مولانا موصوف ایک سیاسی جماعت کے بانی اور جمہوریت نواز ہیں تو دوسری طرف مفسر قرآن۔ لہٰذا ان کی اپنی تحریروں میں یہ تضاد بہت واضح ہو گیا ہے۔

اپنی کتاب ''اسلام کا سیاسی نظریہ'' میں اس آیت کی تشریح میں مولانا مرحوم لکھتے ہیں:

''خلیفہ بنانے کا وعدہ تمام مؤمنوں سے کیا گیا ہے۔ یہ نہیں کہا گیا کہ ان میں سے کسی ایک کو خلیفہ بناؤں گا۔ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ سب مؤمن خلافت کے حامل ہیں۔ یہاں ہر شخص خلیفہ ہے۔ کسی شخص یا گروہ کو یہ حق نہیں کہ عام مسلمانوں سے ان کی خلافت کو سلب کر کے خود حاکم مطلق بن جائے۔ یہاں جو شخص حکمران بنایا جاتا ہے اس کی اصل حقیقت یہ ہے کہ تمام مسلمان یا اصطلاحی الفاظ میں تمام خلفاء اپنی رضا مندی سے اپنی خلافت کو انتظامی اغراض کے لیے اس کی ذات میں مرکوز کر دیتے ہیں جو ایک طرف خدا کے سامنے جواب دہ ہے اور دوسری طرف ان عام خلفاء کے سامنے جنہوں نے اپنی خلافت ان کو تفویض کی ہے۔''

سورۃ المائدۃ میں اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل پر اپنی نعمتوں کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

﴿اِذْ جَعَلَ فِیْكُمْ اَنْۢبِیَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا......﴾(المائدۃ:۲۰)

''جب اللہ نے تم میں سے انبیاء بھی بنائے اور تم کو بادشاہ بھی بنایا......''

*

اس آیت میں صیغہ ''کُمْ'' جمع حاضر اور ''مُلُوکً'' بھی جمع کا لفظ ہے۔لیکن اس آیت سے کسی نے یہ نہیں سمجھا کہ بنی اسرائیل کے جملہ افراد سارے کے سارے ہی بادشاہ تھے جو اپنا حق ملوکیت کسی ایک خاص فرد کو منتقل کر دیتے تھے۔لیکن آیۂ استخلاف میں مندرجہ بالا معنی کر کے بالغ رائے دہی کا حق ثابت کیا جا رہا ہے۔

مذکورہ آیت کی تفسیر تفہیم القرآن میں اس طرح ہے:

''اس ارشاد سے مقصود منافقین کو متنبہ کرنا ہے کہ اللہ نے مسلمانوں کو خلافت عطا فرمانے کا جو وعدہ کیا ہے اس کے مخاطب محض مردم شماری کے مسلمان نہیں بلکہ وہ مسلمان ہیں جو صادق الایمان ہوں' اخلاق و اعمال کے اعتبار سے صالح ہوں' اللہ کے پسندیدہ دین کا اتباع کرنے والے ہوں' اور ہر طرح کے شرک سے پاک ہو کر خالص اللہ کی بندگی و غلامی کے پابند ہوں۔ان صفات سے عاری اور محض زبان سے ایمان کے مدعی لوگ نہ اس وعدے کے اہل ہیں اور نہ یہ ان سے کیا ہی گیا ہے' لہٰذا وہ اس میں حصہ دار ہونے کی توقع نہ رکھیں۔''

یہاں حق رائے دہی کو بہت حد تک مقید کر دیا گیا ہے۔''خلافت و ملوکیت'' میں مولانا موصوف خود ہی حق بالغ رائے دہی کا یہ فیصلہ فرما رہے ہیں:

''حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد جب کچھ لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنانا چاہا تو اُنہوں نے کہا ''تمہیں ایسا کرنے کا اختیار نہیں ہے' یہ تو اہل شوریٰ اور اہل بدر کے کرنے کا کام ہے۔جس کو اہل شوریٰ اور اہل بدر چاہیں گے وہی خلیفہ ہوگا۔پس ہم جمع ہوں گے اور اس معاملے پر غور کریں گے۔''(۵)

ملاحظہ فرمایئے ''اسلام کا نظریہ سیاسی'' کے مطابق تو ہر بالغ مسلمان ووٹ کا حقدار ہے' جبکہ تفہیم القرآن کے مطابق ووٹ دینے کا اہل صرف نیک' صالح اور متقی مسلمان ہو سکتا ہے اور ''خلافت و ملوکیت'' کے مطابق حضرت علیؓ کی اپنی وضاحت یہ ہے کہ انتخاب صرف اہل بدر اور اہل شوریٰ کا کام ہے۔بالالفاظ دیگر نیک اور متقی لوگوں میں سے بھی چند افضل ترین افراد ہی انتخابی مہم میں حصہ لیتے ہیں۔اور یہی بات حق ہے کہ بالغ رائے دہی کے حق کا عام تصور عقل اور شرع دونوں کے خلاف ہے۔کسی لا مذہب سیاست میں تو اسے قبول کیا جا سکتا ہے لیکن اسلامی نظام میں ایسے بے ہودہ نظریات کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔

مغربی تصورِ جمہوریت کے مطابق عورت بھی مرد کی طرح ووٹر بھی ہے' ممبر اسمبلی بھی بن سکتی ہے' صدر بھی بن سکتی ہے اور دوسری کلیدی اسامیوں پر بھی فائز ہو سکتی ہے۔جبکہ عہد نبویؐ اور خلافت راشدہ کی پوری تاریخ کے مطالعہ سے کوئی ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی کہ عورت نے ووٹ دیا ہو' یا

مجلس شوریٰ کی ممبر ہو یا کوئی کلیدی اسامی اس کے سپرد کی گئی ہو یا میدانِ امامت وسیاست میں اس کا کسی قسم کا عمل دخل ہو۔ واحد مثال جو دی جا سکتی ہے وہ جنگ جمل میں اُمّ المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی شمولیت اور قیادت ہے' جنہوں نے شہادتِ عثمان رضی اللہ عنہ اور قصاص کے شدید جذبہ کی وجہ سے جنگ میں شمولیت اختیار کی۔ لیکن یہ بات ریکارڈ پر ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کے اس اقدام کے متعلق انہیں لکھا کہ:

فَاِنَّکِ خرجتِ غاضِبةً للّٰه ولِرسوله تطلبين أمرًا کان علیکِ موضوعًا ما بال النسوة والحرب واصلاح بين الناس (٦)

''آپ اللہ اور رسولؐ (کے احکام-قصاص) کے لیے غضب ناک ہو کر ایک ایسے معاملہ کے لیے نکلی ہیں جس کی ذمہ داری سے آپ سبکدوش تھیں۔ بھلا عورتوں کا جنگ اور لوگوں میں مصالحت سے کیا تعلق ہے؟''

اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی اس جنگ میں شمولیت کے متعلق حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی رائے یہ تھی: ''**انّ بيت عائشة خيرٌ لها من هودجها**''(٧) ''حضرت عائشہؓ کے لیے ان کا گھر ان کے ہودج سے بہتر ہے۔''

خود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا حال یہ تھا کہ جب تلاوتِ قرآن کرتے ہوئے اس آیت ﴿وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ﴾ پر پہنچتی تھیں تو بے اختیار رو پڑتی تھیں' یہاں تک کہ ان کا دوپٹہ بھیگ جاتا تھا' کیونکہ اس پر انہیں اپنی وہ غلطی یاد آجاتی تھی جو ان سے جنگ جمل میں ہوئی تھی۔ (٨)

جمہوری طرزِ انتخاب میں امیدوار کھڑے ہوتے ہیں' نمائندگی کی درخواست دیتے ہیں اور اس کے جملہ لوازمات پورے کرتے ہیں' اپنے انتخاب کے لیے کنویسنگ کرتے ہیں' اخراجات کرتے ہیں۔ جبکہ اسلامی تعلیمات کی رو سے امارت یا منصب طلب کرنا یا اس کی خواہش کرنا ایک مذموم فعل ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دو ارشادات ملاحظہ ہوں:

(ا) **عَنْ اَبِیْ مُوْسٰی رضی اللہ عنہ قَالَ : دَخَلْتُ عَلَی النَّبِیِّ صلی اللہ علیہ وسلم اَنَا وَرَجُلَانِ مِنْ بَنِیْ عَمِّیْ فَقَالَ اَحَدُ الرَّجُلَیْنِ: یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ! اَمِّرْنَا عَلٰی بَعْضِ مَا وَلَّاکَ اللّٰہُ عَزَّوَجَلَّ' وَقَالَ الْاٰخَرُ مِثْلَ ذٰلِکَ' فَقَالَ : ((اِنَّا وَاللّٰہِ لَا نُوَلِّیْ عَلٰی ھٰذَا الْعَمَلِ اَحَدًا سَاَلَہٗ وَلَا اَحَدًا حَرَصَ عَلَیْہِ))** (٩)

حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں اور میرے دو چچا زاد بھائی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئے' ان میں سے ایک نے کہا: ''یا رسول اللہ! اللہ نے آپ کو حکومت بخشی ہے' اس کے کچھ حصہ پر ہمیں حاکم

*

بنا دیجئے۔'' پھر دوسرے نے بھی ایسی ہی بات کہی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ کی قسم! ہم کسی ایسے آدمی کو حاکم نہیں بنایا کرتے جو اس کے لیے درخواست کرے اور نہ ہی کسی ایسے شخص کو حاکم بناتے ہیں جو اس کی حرص رکھتا ہو۔''

(ب) عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ سَمُرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ : قَالَ لِیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: ((یَا عَبْدَ الرَّحْمٰنِ ابْنَ سَمُرَةَ! لَا تَسْئَلِ الْاِمَارَةَ فَاِنْ اُعْطِیْتَھَا عَنْ مَسْئَلَةٍ وُکِلْتَ اِلَیْھَا وَاِنْ اُعْطِیْتَھَا مِنْ غَیْرِ مَسْئَلَةٍ اُعِنْتَ عَلَیْھَا)) (۱۰)

حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ مجھ سے آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''اے عبدالرحمٰن بن سمرہ! حکومت اور سرداری کی درخواست نہ کرنا۔ اگر یہ درخواست پر تمہیں ملے گی تو تمام تر ذمہ داری تمہی پر ہوگی' اور تمہیں بغیر درخواست مل جائے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا۔''

اسلام اور جمہوریت کے حوالے سے مذکورہ بالا چند نکات کے تقابلی مطالعے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ جمہوریت کسی بھی صورت اسلام کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہے۔

خلفائے راشدین کی خلافت کے انعقاد سے متعلق صحیح روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ خلافت محض انتخابی منصب نہیں' بلکہ خلیفۂ وقت خدا کے سامنے جوابدہی کے تصور کو سامنے رکھ کر اگر اپنا جانشین خلیفہ نامزد کر جائے تو یہ صورت صرف جائز ہی نہیں بلکہ بہتر ہے۔

نبی اکرم ﷺ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ نامزد کرنے کا ارادہ فرمایا تھا لیکن اس یقین کی وجہ سے یہ ارادہ ترک کر دیا کہ ''مسلمان کسی دوسرے کا خلیفہ بننا گوارا نہیں کر سکتے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کو یہ منظور ہے۔'' آپ ﷺ کا ترکِ ارادہ جملہ مسلمانوں کی دلجوئی اور ان پر آپ ﷺ کی شفقت کا مظہر تھا۔ یعنی اگر کچھ لوگ آس لگائے بیٹھے ہوں تو ان کی دل شکنی نہ ہو۔ جیسا کہ نبی اکرم ﷺ کے درج ذیل ارشادات سے واضح ہے:

((لَقَدْ هَمَمْتُ اَوْ اَرَدْتُ اَنْ اُرْسِلَ اِلٰی اَبِیْ بَکْرٍ وَابْنِهٖ فَاَعْھَدَ اَنْ یَقُوْلَ الْقَائِلُوْنَ اَوْ یَتَمَنَّی الْمُتَمَنُّوْنَ ثُمَّ قُلْتُ: یَاْبَی اللّٰہُ وَیَدْفَعُ الْمُؤْمِنُوْنَ اَوْ یَدْفَعُ اللّٰہُ وَیَاْبَی الْمُؤْمِنُوْنَ)) (۱۱)

''میں نے یہ قصد کیا کہ کسی کو بھیج کر ابوبکرؓ اور ان کے بیٹے (عبدالرحمٰنؓ) کو بلا بھیجوں اور (ابو بکرؓ کو) اپنا جانشین کر جاؤں' مبادا میرے بعد کہنے والے کچھ اور کہیں اور آرزو کرنے والے (خلافت کی) آرزو کرنے لگیں۔ پھر میں نے (دل میں) کہا: خود اللہ کسی اور کو خلیفہ نہ ہونے دے گا' نہ مسلمان اور کسی کی اطاعت قبول کریں گے۔''

عَنْ عَائِشَةَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھَا قَالَتْ: قَالَ لِیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ فِیْ مَرَضِهٖ

((ادْعِیْ لِیْ اَبَا بَکْرٍ اَبَاکِ وَاَخَاکِ حَتّٰی اَکْتُبَ کِتَابًا فَاِنِّیْ اَخَافُ اَنْ یَتَمَنّٰی مُتَمَنٍّ وَیَقُوْلُ قَائِلٌ اَنَا اَوْلٰی وَیَاْبَی اللّٰہُ وَالْمُؤْمِنُوْنَ اِلَّا اَبَابَکْرٍ))(۱۲)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی مرض موت کے دوران فرمایا: ''اپنے باپ ابوبکر اور اپنے بھائی (عبدالرحمٰن) کو بلا بھیجو تاکہ میں وصیت لکھ دوں۔ مجھے ڈر ہے کہ حریص اس کی آرزو کریں گے اور کچھ کہنے والے یہ بھی کہیں گے کہ خلافت کا حقدار میں زیادہ ہوں۔ مگر ابوبکرؓ کی خلافت کے سوا نہ تو اللہ کسی اور کی خلافت کو تسلیم کرے گا اور نہ ہی مسلمان۔''

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ نامزد کر دیا۔ نامزدگی کے وقت ان کے سامنے درج ذیل باتیں تھیں:

(۱) ان کے نزدیک اُمت میں حضرت عمرؓ سے زیادہ خلافت کے لیے کوئی اہل تر نہ تھا۔

(۳) اُنہوں نے اپنے کسی قریبی رشتہ دار کو نامزد نہیں کیا۔

(۳) نامزدگی کے سلسلہ میں خدا کے سامنے جوابدہی کا تصور غالب تھا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جب یہ کہا گیا کہ خلیفہ نامزد کر جایئے تو آپؓ نے یہ نہیں فرمایا کہ ایسا کیوں کہتے ہو' خلافت تو محض ایک انتخابی منصب ہے' بلکہ یوں فرمایا: ''اگر میں خلیفہ نامزد کر جاؤں تو (بھی ٹھیک ہے' کیونکہ) حضرت ابوبکرؓ جو مجھ سے بہتر تھے خلیفہ مقرر کر گئے تھے' اور اگر نہ کروں تو (بھی ٹھیک ہے' کیونکہ) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جو مجھ سے بہتر تھے خلیفہ نہیں بنا گئے تھے۔''(۱۳)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نامزدگی کو اس صورت میں ترجیح دے سکتے تھے جبکہ کوئی اہل تر آدمی ان کے پاس موجود ہوتا۔ جیسا کہ آپؓ نے حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ اور حضرت سالم رضی اللہ عنہ کے نام بھی لیے کہ اگر ان میں سے کوئی بھی زندہ ہوتا تو اسے ہی نامزد کرنے کو ترجیح دیتے۔ اپنے بیٹے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کو آپؓ نے اس لیے نامزد نہیں کیا کہ آپؓ خلافت کی ذمہ داریوں کو ایک کٹھن کام سمجھتے تھے اور خدا کے سامنے جوابدہی کے تصور سے ڈر کر خلافت کو اپنے تک محدود نہیں رکھنا چاہتے تھے۔(۱۴)

اب ثانوی شکل یہ رہ گئی تھی کہ انہوں نے خلافت کے لیے چھ آدمیوں کو نامزد کیا۔ کسی ایک کو نامزد کرنے کی وجہ یہ تھی کہ آپؓ کی نظر میں ان چھ آدمیوں میں سے ہر ایک میں کچھ نہ کچھ کمی تھی۔ لہٰذا انتخاب کی ذمہ داری انہی پر ڈال دی۔ اگر انہیں کسی ایک پر بھی اطمینان ہو جاتا تو وہ یقیناً نامزدگی کو انتخاب پر ترجیح دیتے۔

*

بخاری شریف کے کتاب المناقب میں زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ کے مناقب میں موجود حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے بھی ایک مرتبہ لوگوں نے خلیفہ نامزد کرنے کو کہا تھا۔ علامہ وحید الزمان ؒ نے اس حدیث پر یہ نوٹ بھی دیا ہے کہ ''حضرت عثمان ؓ نے اپنے بعد خلافت عبدالرحمٰن بن عوف ؓ کے لیے لکھ کر اپنے منشی کے پاس وہ کاغذ رکھوا دیا تھا۔ مگر حضرت عبدالرحمٰن بن عوف ؓ ان کی زندگی میں ہی ۲۳ ہجری میں انتقال کر گئے۔''

حضرت علی رضی اللہ عنہ کو آخری وقت میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو خلیفہ نامزد کرنے کو کہا گیا تو آپ ؓ نے نہ تو یہ فرمایا کہ استخلاف ناپسندیدہ یا ناجائز کام ہے اور نہ ہی یہ فرمایا کہ باپ کے بعد بیٹا کیونکر نامزد کیا جاسکتا ہے! جب حضرت جندب بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نے آپ ؓ سے کہا کہ ''اے امیرالمؤمنین! اگر آپ فوت ہوجائیں تو ہم حضرت حسن ؓ کے ہاتھ پر بیعت کرلیں؟'' تو فرمایا: ''**لَا آمُرُکُمْ وَلَا اَنْھَاکُمْ اَنْتُمْ اَبْصَرُ**'' یعنی ''میں نہ تمہیں اس کا حکم دیتا ہوں نہ منع کرتا ہوں، تم خود بہتر سمجھتے ہو۔''(۱۵)

ان تصریحات سے واضح ہے کہ خلافت محض انتخابی منصب نہیں بلکہ خلیفۂ وقت اللہ کے سامنے جوابدہی کے تصور کو سامنے رکھ کر اگر خلیفہ نامزد کر جائے تو یہ صورت صرف جائز ہی نہیں بلکہ بہتر ہے۔ دوسرا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ باپ کے بعد بیٹا بھی خلیفہ بن سکتا ہے جیسا کہ حضرت حسن ؓ کی خلافت کو متفقہ طور پر خلافت راشدہ میں شمار کیا جاتا ہے اور تیسرا یہ کہ باپ اگر خود بیٹے کو نامزد کر دے بشرطیکہ وہ اس کا اہل بھی ہو تو یہ بھی کوئی گناہ کی بات نہیں بلکہ جائز ہے۔ جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ارشاد سے واضح ہوتا ہے۔

اس مضمون کی تیاری میں درج ذیل کتب سے مدد لی گئی ہے: (۱) اسلام کا قانون شہادت، مولانا سید محمد متین ہاشمی ؒ (۲) اسلامی سیاست، مولانا گوہر رحمٰن ؒ (۳) خلافت و جمہوریت، مولانا عبدالرحمٰن کیلانی ؒ، (۴) علم جدید کا چیلنج، مولانا وحید الدین خان

حواشی

(۱) ضعیف الجامع الصغیر للالبانی: ۱۲۵۲۔

(۲) مجمع الزوائد للھیثمی ۹/۵۵۔

(۳) صحیح البخاری، کتاب الایمان، باب فان تابوا واقاموا الصلاۃ...... وصحیح مسلم، کتاب الایمان، باب الامر بقتال الناس۔

(۴) صحیح البخاری، کتاب الشھادات، باب ما قیل فی شھادۃ الزور۔ وصحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان الکبائر واکبرھا۔

(باقی صفحہ 96 پر)

کو قانونی طور پر اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ حافظ الاسد چوتھی مرتبہ صدارتی انتخاب میں کامیاب ہوئے۔

2000ء۔ 10 جون کو حافظ الاسد حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال کر گئے۔ ان کے بیٹے بشار الاسد ملک کے نئے صدر بنے۔

2001ء۔ شام نے بیروت سے اپنی 25 ہزار سپاہیوں کی فوج واپس بلا لی۔ تاہم شامی فوج کا ایک دستہ لبنان میں موجود رہا۔

2003ء اپریل۔ امریکی صدر بش نے عراق پر قبضہ جما لینے کے بعد اپنی جارحیت کا رُخ شام کی طرف پھیر دیا اور عام طور پر کہا جانے لگا کہ اب شام کی باری ہے۔ بش نے اپنے تئیں جن بدمعاش ریاستوں کے نام لیے تھے ان میں شام بھی شامل تھا۔ ایک امریکی الزام یہ بھی تھا کہ شام کے پاس کیمیائی ہتھیار ہیں۔ امریکہ نے سفارتی اور معاشی پابندیوں کی دھمکی دی' لیکن شام نے اس کا کوئی اثر نہ لیا۔ تاہم ابھی تک امریکہ کے عزائم میں شام' ایران اور پاکستان شامل ہیں۔ مقصد اِن کو کمزور کرنا ہے تاکہ خطے میں اسرائیل کو مضبوط سے مضبوط تر بنا کر اسلامی قوتوں کو ابھرنے نہ دیا جائے۔

بقیہ: اسلام اور جمہوریت

(٥) خلافت و ملوکیت' ص٨٦' بحواله ابن قتيبه الامامة والسياسة' ج١' ص ٤١۔

(٦) الامامة والسياسة' ص ٧٠۔

(٧)حواله سابقه' ص ٦١۔

(٨) تفهيم القرآن' ج٤' ص ٩١۔

(٩) صحيح البخارى' كتاب الاحكام' باب ما يكره من الحرص على الامارة۔وصحيح مسلم' كتاب الامارة' باب النهى عن طلب الامارة......

(١٠) صحيح البخارى' كتاب الاحكام'باب من سأل الامارة وكل اليها۔ وصحيح مسلم' كتاب الامارة' باب النهى عن طلب الامارة والحرص عليها۔

(١١) صحيح البخارى' كتاب الاحكام' باب الاستخلاف۔

(١٢) صحيح مسلم' كتاب فضائل الصحابة' باب من فضائل ابى بكر الصديق۔

(١٣) صحيح البخارى' كتاب الاحكام' باب الاستخلاف۔

(١٤) تاريخ طبرى' ج٤۔

(١٥) البداية والنهاية۔

قسط وار سلسلہ (55)

شام

(SYRIA)

تحقیق و تحریر: سید قاسم محمود

شام : ایک نظر میں

پورا نام: جمہوریہ العربیہ السوریہ
رقبہ: 185,180 مربع کلومیٹر
آبادی: تقریباً دو کروڑ
اوسط عمر: 70
گنجانی آبادی: 2.52 فی مربع میل
دارالحکومت: دمشق (تقریباً 25 لاکھ)
زبانیں: عربی، کردی، آرمینی، فرانسیسی
نسلیں: عرب 90 فی صد، باقی کرد، آرمینی اور دیگر
مذہب: مسلمان 74 فیصد، علوی، دروز اور دیگر مسلم فرقے 16 فی صد، عیسائی 10 فیصد
شرح خواندگی: 77 فیصد
کل قومی پیداوار: 59 ارب ڈالر سالانہ
فی کس آمدنی: 3300 ڈالر سالانہ
افراطِ زر: 1.5 فی صد
بے روزگاری: 20 فی صد سالانہ
قابل کاشت رقبہ: 25 فیصد

زراعت: گندم، جو، کپاس، دالیں، مٹر، زیتون، چقندر، گوشت، دودھ
صنعت: تیل، پارچہ بافی، ڈبہ بند غذا، مشروبات، تمباکو، کان کنی
تیل کی پیداوار: پانچ لاکھ 22 ہزار بیرل روزانہ
تیل کے ذخائر: 2.4 ارب بیرل
گیس کے ذخائر: 24.07 ارب کیوبک میٹر
برآمدات: 5.143 ارب ڈالر (خام تیل، تیل کی مصنوعات، پھل، سبزیاں، کپاس، پارچات، گوشت، گندم)
درآمدات: تقریباً 5 ارب ڈالر (مشینری، ٹرانسپورٹ کے آلات، الیکٹرونکس، غذا، دھات کاری، کیمیکل، پلاسٹک)
تجارتی ساتھی: جرمنی، اٹلی، متحدہ عرب امارات، چین، لبنان، ترکی، فرانس، کروشیا، امریکہ
کرنسی: شامی پاؤنڈ

شام بحیرۂ روم کے مشرقی ساحل پر واقع ہے۔ شمالاً جنوباً 310 میل لمبا اور شرقاً غرباً 290 میل چوڑا ہے۔ شمال میں ترکی، مشرق میں عراق، جنوب میں اردن، جنوب مغرب میں اسرائیل اور لبنان، اور مغرب میں بحیرۂ روم واقع ہیں۔ بیشتر آبادی سنّی مسلمانوں کی ہے، جبکہ شیعہ، اسماعیلی، دروز اور عیسائی بھی آباد ہیں۔

شام کا بیشتر حصہ ریگستانی ہے۔ بحیرۂ روم کے قریب واقع انصاریہ پہاڑی سلسلہ، وسطی شگافی وادی اور لبنان کی پہاڑیوں کے درمیان واقع چند زرخیز وادیاں اور نخلستان ہیں جن میں حما، حمزا اور دمشق وادی قابل ذکر ہیں۔ شام بنیادی طور پر ایک زرعی ملک ہے۔ ملک کی 70 فیصد آبادی کا انحصار

کھیتی باڑی پر ہے۔ چند سیراب ہونے والے علاقوں کو چھوڑ کر شام کی کھیتی کا دار و مدار بارش پر ہے۔ کپاس ایک اہم نقدی فصل ہے جسے برآمد کر کے زرِمبادلہ حاصل کیا جاتا ہے۔

شام کی ایک بڑی ریلوے لائن حلب شہر سے ترکی کو پار کرتی ہوئی جزیرہ صوبے سے گزر کر عراق تک جاتی ہے۔ دوسری ریلوے لائن حجاز ریلوے لائن کہلاتی ہے۔ یہ ریلوے لائن درحقیقت حاجیوں کو مکہ اور مدینہ لے جانے کے لیے تعمیر کی گئی تھی۔ صنعتی اور شہری ترقی کے لیے دوسری جنگ عظیم کے بعد سے شام میں سڑکوں کا جال پھیلایا گیا۔ سب شہر اور قصبے پختہ سڑکوں کے ذریعے ایک دوسرے سے منسلک ہیں۔

شام کا دار الحکومت دمشق ہے جو ایک قدیم تاریخی شہر ہے۔ دوسرے بڑے شہر یہ ہیں: حلب (24 لاکھ)، حمص (8 لاکھ)، لتاکیہ (4 لاکھ)، حمّہ (4 لاکھ)۔

شام ایک قدیم تہذیبی اور باثروت ملک ہے۔ پندرہویں صدی قبل مسیح میں اس پر مصریوں نے قبضہ کیا۔ بعد ازاں حضرت داؤد علیہ السلام کی اسرائیلی سلطنت کا حصہ بنا۔ انہوں نے یہاں 1000 تا 962 ق م حکومت کی۔ 530 ق م میں اہل فارس اس پر قابض ہوئے۔ 333 ق م میں سکندر اعظم نے شام کو فتح کر کے ایرانی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ 85 ق م میں یہاں نباطی آئے۔ 64 ق م میں رومیوں نے اسے فتح کر کے پورے شام کو رومی صوبے میں ضم کر دیا۔ چوتھی صدی عیسوی میں دمشق بازنطینی حکومت کی فوجی چھاؤنی بنا۔ پانچویں صدی عیسوی میں شامی سرحدوں کی حفاظت کا کام غسانی سرداروں کے سپرد تھا جو نسلاً عرب اور مذہباً عیسائی تھے۔ یہ شامی عرب ایک ایسی بولی بولتے تھے جو عربی اور ارامی کے اختلاط سے بنی تھی۔

تبوک عرب اور شام کا سرحدی مقام ہے۔ اس علاقے پر بازنطینی حکومت کی طرف سے عرب سردار حکومت کرتے تھے۔ آغازِ اسلام سے قبل عرب پر رومیوں کے حملوں کی افواہیں پھیلتی رہتی تھیں۔ اس خطرے کے پیش نظر آنحضور ﷺ نے ۹ ہجری میں تبوک کا قصد کیا۔ تبوک پہنچ کر معلوم ہوا کہ حملے کی افواہیں غلط تھیں۔ آنحضور ﷺ نے بیس روز تک تبوک میں قیام کیا اور ارد گرد کے حکمرانوں کو، جن کی جانب سے خطرات تھے، مطیع بنا کر مدینہ منورہ میں تشریف لے آئے۔

آنحضور ﷺ کی وفات تک رومیوں کے حملے کا خطرہ رہتا تھا۔ چنانچہ اس خطرے کے سدِّ باب اور شہدائے موتہ کا بدلہ لینے کے لیے آنحضور ﷺ نے اُسامہ بن زیدؓ کو شام بھیجنے کا قصد کیا تھا کہ آپ ﷺ رحلت فرما گئے۔ اس لیے 13 ہجری میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کبار صحابہؓ کے مشورے سے شام پر فوج کشی کا فیصلہ کیا۔ دِمشق کی مہم پر یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ، حمص پر ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ، اردن پر شرحبیل ابن حسنہ رضی اللہ عنہ اور فلسطین پر عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ مأمور ہوئے۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ ان سب کے سالار

مقرر ہوئے۔ بازنطینی (رومی) افواج کی کثرت کا اندازہ کرتے ہوئے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو، جو اُس وقت عراق میں تھے، حکم دیا کہ وہ شام چلے جائیں، چنانچہ وہ بھی شام کی مہم پر روانہ ہو گئے۔

مارچ 635ء میں عربوں نے دِمشق کی دیواروں کے زیرِ سایہ ڈیرے ڈال دیے۔ لڑائی میں شامیوں نے رومی افواج کا ساتھ دیا۔ اس لیے انہیں مکمل شکست ہوئی۔ جنگ یرموک (636ء) نے شام کی قسمت کا فیصلہ کر دیا اور پورا علاقہ تلوار اٹھائے بغیر فتح ہوتا چلا گیا اور شام قیامت تک کے لیے حلقہ بگوشِ اسلام ہو گیا۔

ہجری کا اٹھارہواں سال عموماً طاعون کی وبا پھیلنے کے لیے مشہور ہے۔ اس میں ہزاروں مسلمان لقمۂ اجل بنے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے شام کا سفر کیا اور مناسب اقدامات کیے۔ یزید بن ابی سفیانؓ کا انتقال 18 ہجری میں ہوا تو حضرت عمرؓ نے اُن کی جگہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو حاکم مقرر کیا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں انہیں پورے شام کا والی بنا دیا۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے شام کے سرحدی علاقے فتح کر کے اُس کی سرحدوں کو وسعت دی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی اجازت سے امیر معاویہؓ نے ایک بحری بیڑا بھی تیار کیا اور اس کے ذریعے جزیرہ قبرص فتح کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے درمیان خانہ جنگی کے باعث حضرت علیؓ کے عہد خلافت میں امیر معاویہؓ شام کے آزاد اور خود مختار حکمران بن گئے۔ حضرت علیؓ کے انتقال اور امام حسنؓ کی دست برداری کے بعد امیر معاویہؓ تمام عالمِ اسلام کے خلیفہ ہو گئے اور اُن کا دارالحکومت دمشق قرار پایا۔ ان کے عہد میں اسلامی سلطنت کی حدود میں اضافہ ہوا۔ ان کا انتقال 60ھ/679ء میں ہوا۔

حضرت امیر معاویہؓ کے جانشین ان کے بیٹے یزید بن معاویہ کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے عہد حکومت میں امام حسین رضی اللہ عنہ اور ان کے خانوادے کی شہادت، مدینۃ الرسولؐ کی پامالی اور حرم محترم کی بے حرمتی ہوئی، جس کی وجہ سے عالم اسلام میں بنواُمیہ کے خلاف نفرت و حقارت کے جذبات پرورش پانے لگے۔

یزید کے بیٹے دائم المرض معاویہ ثانی کا عہد حکومت فقط چند روزہ تھا۔ وہ 64ھ/683ء میں طاعون کا شکار ہوا۔ اس کے دوسرے بھائیوں کی کم سنی کے باعث امرائے شام مروان بن الحکم کی حمایت کرنے پر مجبور ہو گئے۔ مروان کا عہد حکومت پیہم لڑائیوں اور جنگوں کا عہد تھا۔ اس کی وفات پر اس کا بڑا بیٹا عبدالملک تخت نشین ہوا۔ وہ اُموی حکومت کا دوسرا بانی تھا۔ اس نے نہایت عزم و استقلال سے ملک میں امن و امان قائم کیا۔ عبدالملک نے بیس سال حکومت کی۔ اس کا انتقال

86ھ/705ء میں ہوا۔

اس کے بعد اُس کا جانشین ولید اوّل تخت نشین ہوا۔ اس کے عہد کا زرّیں کارنامہ فتح اندلس ہے۔ اس کے بعد اس کا بھائی سلیمان بن عبدالملک اور اس کے بعد اس کے چچا زاد بھائی حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ تخت نشین ہوئے۔ ان کے عدل وانصاف نے خلافتِ راشدہ کی یاد تازہ کر دی۔ ذمیوں اور مسلمانوں کی جان و مال کی حفاظت میں عمر بن عبدالعزیزؒ نے کوئی فرق روا نہ رکھا۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے بعد نااہل لوگ حکومت پر قابض ہو گئے جس کے باعث ملک میں فساد پیدا ہونا شروع ہو گیا۔ خوارج کی بغاوت نے ملک میں الگ آفت مچا رکھی تھی۔ اہل شام کی بے اطمینانی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ابوالعباس السفاح نے کوفے میں اپنی خلافت کا اعلان کر دیا۔ مروان کو اُس سے لڑائی میں شکست ہوئی۔ پہلے اس نے عراق کا علاقہ خالی کیا۔ بعد ازاں شام بھی چھوڑنا پڑا۔ اہل شام اُس کا ساتھ دینے کے لیے تیار نہ تھے' چنانچہ اس نے مصر میں پناہ لی' جہاں 132ھ/750ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔

بنواُمیہ کے اقتدار کا سورج غروب ہونے کے بعد ان کا ہر جگہ تعاقب کیا گیا۔ اُن کی قبریں اکھاڑ کر اُن کی خاک ہوا میں اڑائی گئی۔ شامیوں نے نہایت کوشش کی کہ کسی طرح اپنا کھویا ہوا اقتدار واپس لے لیں' لیکن انہیں اس میں کامیابی نصیب نہ ہوئی۔

فتح شام کے بعد اہل شام کی زبان عربی ہو گئی۔ عبدالملک نے عربی کو دفتری زبان قرار دے دیا تھا۔ چنانچہ غیر مسلم قوموں کے لیے بھی عربی کا سیکھنا لازمی ہو گیا۔ اُموی حکمران شعر و شاعری سے شغف رکھتے تھے۔ چنانچہ عربی کے بہت سے نامور شعراء اخطل' جریر' فرزوق' ابن ابی ربیعہ اور جمیل ابن معمر وغیرہ اسی دَور سے تعلق رکھتے ہیں۔ حجاج بن یوسف' حسن بصری اور طارق بن زیاد اسی دَور کے ممتاز خطیب تھے۔

اُس زمانے میں دینی علوم کی تحصیل کا عام ذوق پیدا ہو گیا تھا۔ مکہ' مدینہ' کوفہ اور بصرہ میں اکابر صحابہؓ کے شاگرد شائقین حضرات کو قرآن' حدیث' فقہ' سیرت و مغازی کی تعلیم دیتے تھے۔ حدیث کی تدوین اور اشاعت عمر بن عبدالعزیزؒ کے اعمالِ حسنہ میں شامل ہے۔ مغازی اور سیرت کے مشہور امام محمد بن اسحاق اسی دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ ابتدا میں عربی خط میں نقطے اور اعراب نہ تھے۔ عجمی قومیں مسلمان ہوئیں تو عربی پڑھنے میں غلطی کرتی تھیں' اس لیے حجاج بن یوسف نے قرآن مجید میں نقطے اور اعراب لگوائے۔

بنواُمیہ کے زوال کے ساتھ ہی شام اپنی ممتاز حیثیت سے محروم ہو گیا۔ شامیوں کی برتری ختم ہو گئی۔ اب نیا صدر مقام بغداد تھا جو صدیوں تک اسلامی جاہ و جلال کی عظیم علامت رہا۔ قیسی اور یمنی

قبائل کی باہمی چپقلش خون ریز خانہ جنگی کی صورت اختیار کرگئی تھی۔ 825ء میں خلیفہ مامون الرشید شام آیا اور ارضیات کی از سرِ نو پیمائش کرائی۔ 858ء میں خلیفہ المتوکل نے دارالحکومت کو دِمشق منتقل کر دیا۔

عباسی دَور میں اسلام کی اشاعت وسیع پیمانے پر ہوئی۔ بہت سے عیسائی قبیلے حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ شامی عیسائیوں کو فلسفے اور الٰہیات کے علاوہ طب اور فلکیات سے بھی شغف تھا۔ چنانچہ اس عہد میں بہت سی سریانی اور یونانی کتابیں عربی میں منتقل ہوگئیں۔ اس طرح ارسطوؔ افلاطون اور جالینوس وغیرہ کی بیشتر تصانیف عربی خواں طلبہ کی دسترس میں آ گئیں۔

شام کی سرحدی قلعہ بندیوں کا ابتدائی سلسلہ عباسی خلفاء کا تعمیر کردہ ہے۔ یہ قلعے بازنطی حملہ آوروں کو روکنے کے لیے بنائے گئے تھے۔

977ء سے 998ء تک شام ایک علوی یا زیادہ صحیح لفظوں میں ایک اسماعیلی خاندان یعنی فاطمیوں کے قبضے میں رہا۔ ان کا براہِ راست اثر ورسوخ اُس وقت تک رہا جب تک کہ ان کی افواج ملک پر قابض رہیں۔ 1097ء میں صلیبی فوجیں انطاکیہ کی فصیل تک آ گئیں اور ایک طویل محاصرے کے بعد 3 جون 1098ء کو یہ فوجیں قلعے میں داخل ہوگئیں۔ ہوتے ہوتے یہ فرنگی بیت المقدس کی دیواروں کے سامنے آ نکلے اور 1099ء میں بھرپور حملہ کرکے یہ علاقہ فتح کرلیا اور اس کو ایک لاطینی ریاست بنا کر گوڈفرے کو اس کا سردار بنا دیا گیا؛ لیکن بیت المقدس کا پہلا بادشاہ دراصل اس کا بھائی اور جانشین بالڈون اوّل تھا۔ اُس نے کئی ساحلی شہر فتح کیے۔ اُس کے جانشین بالڈون ثانی نے 1124ء میں صور فتح کیا۔ دمشق کے سامنے اسے ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔

بالڈون ثانی کے بعد لاطینی ریاست کا زوال شروع ہوگیا؛ جس کی وجہ صلیبیوں کا عدم تعاون اور عدم اتحاد تھا۔ ہر گروہ اپنی اپنی علیحدہ سلطنت اور اقتدار کا خواہش مند تھا۔ اس اتحاد کے فقدان کا فائدہ اٹھا کر تمام مسلمان سلطان نورالدین زنگیؒ اور پھر سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کے پرچم تلے جمع ہو گئے اور صلیبیوں کے ساتھ جنگوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوگیا؛ جس میں بالآخر صلاح الدین ایوبی کو کامیابی نصیب ہوئی۔

سلطان صلاح الدین ایوبی کے انتقال کے بعد متعدد وارثوں میں تنازعے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس سے فائدہ اٹھا کر خوارزمیوں نے حملہ کر دیا اور غزہ کے مقام پر شامیوں اور فرنگیوں کی افواج کو شکست دی اور مصریوں کو بیت المقدس، دِمشق اور حمص پر قبضہ کرنے کا موقع دیا۔

ایوبیوں کے بعد مملوک سلاطین شام و مصر میں برسرِ اقتدار آئے۔ ان کے چوتھے حکمران بیبرس نے جالوت کے مقام پر تاتاریوں کو شکست دی اور صلیبیوں کے خلاف شاندار کامیابی حاصل کی۔ شام

پر تاتاری یورشوں میں آخری یورش امیر تیمور کی تھی۔ وہ آندھی کی طرح وسطِ ایشیا سے اٹھا اور طوفان کی طرح اسلامی دنیا پر چھا گیا۔ اس نے 1400ء میں حلب فتح کر لیا اور اسے تین روز تک قتل و غارت گری کا نشانہ بنائے رکھا۔ نورالدین زنگی اور صلاح الدین ایوبی کی عمارات نذرِ آتش کر کے راکھ کر دیں۔ شہر کو لوٹا اور مساجد کو آگ لگوا دی۔ دِمشق کے بہترین اربابِ فن، مشاہیر اور علماء سمرقند بھیج دیے گئے اور یوں شام کی علمی، فنی اور صنعتی برتری ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔

اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں شام کے حوالے سے تین اشخاص مشہور ہوئے۔ یہ الظاہر العمر، احمد پاشا الجزار اور نپولین بونا پارٹ تھے۔ الظاہر نے عکّہ پر قبضہ کر لیا، لیکن آخر مارا گیا۔ احمد پاشا الجزار کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے نپولین کی پیش قدمی روک دی۔ ترکوں کے تین سو سالہ عہدِ حکومت میں شام اور فلسطین کی آبادی جو عرب فتوحات کے وقت چالیس لاکھ تھی، صرف پندرہ لاکھ باقی رہ گئی تھی۔

1864ء ۔ شام دو ولایتوں میں بٹ گیا: دِمشق اور حلب۔

1888ء ۔ بیروت کو جو شام کی بڑی بندرگاہ تھی، علیحدہ ولایت بنا دیا گیا۔ ابراہیم پاشا کے زمانے سے شام کے دروازے مغرب کے ثقافتی اثرات کے لیے کھل گئے تھے۔ اس کے بعد امریکی مشنریوں نے مضبوطی سے وہاں قدم جمانے شروع کیے۔ فرانسیسی اور انگریزی کتابوں کا بکثرت عربی میں ترجمہ ہونے لگا۔ عیسائیوں نے بیروت میں سینٹ جوزف یونیورسٹی قائم کی۔ علمی ترقی کے ساتھ ساتھ حفظانِ صحت کے وسائل بہتر ہو گئے اور معاشی ترقی ہونے لگی۔

1914ء ۔ 29/اکتوبر کو ترکی پہلی جنگ عظیم میں شامل ہو گیا۔ ترکی کے جمال پاشا نے سارے شام کی عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ بہت سے قوم پرست عرب رہنماؤں کو تختۂ دار پر لٹکا دیا۔ وہ نہر سویز پر حملہ کرنے کے لیے بڑھا لیکن ناکام رہا اور رفتہ رفتہ انگریزوں نے بزور طاقت ملک پر قبضہ کر لیا اور فرانسیسی امدادی فوج نے بھی شام کی طرف اپنے قدم جما لیے۔

1920ء ۔ 24 جولائی کو فرانسیسی فوج دمشق میں داخل ہو گئی۔ ایک معاہدے کی رو سے شام کو سلطنت عثمانیہ سے علیحدہ کر دیا گیا۔

بعد ازاں شام کے عوام کو محسوس ہونے لگا کہ فرانسیسی اقتدار کی حکومت سلطنت عثمانیہ کے مقابلے میں زیادہ سخت گیر ہے۔ اس کے علاوہ فرانسیسیوں نے بعض ایسے اقدامات کیے جن کو لوگ برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ آخر کار تنگ آمد بجنگ آمد کے مصداق بغاوتوں اور ہڑتالوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہ بغاوتیں 1925ء کی عام بغاوت کا باعث بنیں۔ فرانسیسیوں نے 48 گھنٹے تک دمشق پر گولہ باری کی۔ ان کے اس اقدام کو دنیا بھر میں غم و غصے کی نظر سے دیکھا گیا۔ بالآخر ایک سمجھوتے کے

تحت 17 اپریل 1946ء کو تمام فرانسیسی فوجیں شام سے ہمیشہ کے لیے نکل گئیں۔

اب شام کے صدر شکری القوا تلی کی رہنمائی میں آزادی کا سفر شروع ہوا۔ 1948ء میں اسرائیل کے قیام نے عالمِ اسلام میں ہیجان پیدا کر دیا۔ عرب ممالک نے، جن میں شام بھی شامل تھا، اسرائیل کے خلاف ناکام پیش قدمی کی۔ اس دوران میں شام کے حالات بگڑتے چلے گئے۔ اس سیاسی خلفشار کے پیش نظر یکم فروری 1958ء کو قاہرہ سے دونوں ملکوں مصر اور شام کے اتحاد کا اعلان ہو گیا اور اس کا نام ''جمہوریہ متحدہ عرب'' رکھا گیا۔ جمال عبدالناصر اس کے صدر منتخب ہوئے، لیکن مصریوں کی بالا دستی کے سبب یہ اتحاد برقرار نہ رہ سکا اور 28 ستمبر 1961ء کو شامیوں نے مصریوں کو شام سے علیحدگی پر مجبور کر دیا۔

1963ء۔ سوشلسٹ پارٹی نے فوج کے ساتھ مل کر حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ نئی حکومت نے پٹرول اور دیگر معدنیات کو قومی ملکیت میں لے لیا۔

1966ء۔ پھر فوجی انقلاب آیا جس میں بعث پارٹی کے انتہا پسند برسر اقتدار آ گئے۔

1967ء۔ عرب اسرائیل جنگ میں اسرائیل نے جولان کی پہاڑیوں پر قبضہ کر لیا۔

1969ء مارچ۔ جنرل حافظ الاسد شام کے صدر بنے اور نور الدین عطاشی کو معزول کر دیا گیا۔

1973ء۔ شام نے اسرائیل سے جنگ کر کے اپنا کچھ علاقہ واگزار کرا لیا جو 1967ء میں عرب اسرائیل جنگ کے موقع پر اسرائیل نے ہتھیا لیا تھا۔

1976ء۔ لبنان میں خانہ جنگی شروع ہوئی تو شام کی فوجیں وہاں داخل ہو گئیں۔

1980ء۔ صدر حافظ الاسد نے اپنی کابینہ سے بعث پارٹی کے چودہ ارکان کو برطرف کر دیا جن میں وزیر اعظم حلبی بھی شامل تھے۔ 37 رکنی نئی کابینہ بنائی اور عبدالرؤف قاسم کو وزیر اعظم مقرر کیا۔ اسی سال شام اور لیبیا کے الحاق کا فیصلہ کیا گیا، لیکن اس پر عملدر آمد نہ ہو سکا۔

1981ء۔ شام نے اسرائیل کے جیٹ طیاروں کو مار گرانے کے لیے پہلی مرتبہ میزائل استعمال کیے۔

1982ء۔ بیروت کے اسرائیلی حملے کے دوران شام نے یاسر عرفات اور اہل فلسطین کی ہر ممکن مدد کی۔

1990ء۔ شام نے کویت پر عراق کے حملے کے خلاف آواز بلند کی اور سعودی عرب پر عراق کے ممکنہ حملے کے پیش نظر سعودی عرب کی مدد کے لیے اپنی فوج روانہ کی۔ خلیجی جنگ کے بعد اسرائیل سے امن مذاکرات کی امید قائم ہوئی جو پوری نہ ہو سکی۔ صدر حافظ الاسد نے حزب الاسد کی جماعتوں

کو قانونی طور پر اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ حافظ الاسد چوتھی مرتبہ صدارتی انتخاب میں کامیاب ہوئے۔

2000ء۔ 10 جون کو حافظ الاسد حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال کر گئے۔ ان کے بیٹے بشار الاسد ملک کے نئے صدر بنے۔

2001ء۔ شام نے بیروت سے اپنی 25 ہزار سپاہیوں کی فوج واپس بلا لی۔ تاہم شامی فوج کا ایک دستہ لبنان میں موجود رہا۔

2003ء اپریل۔ امریکی صدر بش نے عراق پر قبضہ جما لینے کے بعد اپنی جارحیت کا رُخ شام کی طرف پھیر دیا اور عام طور پر کہا جانے لگا کہ اب شام کی باری ہے۔ بش نے اپنے تئیں جن بدمعاش ریاستوں کے نام لیے تھے ان میں شام بھی شامل تھا۔ ایک امریکی الزام یہ بھی تھا کہ شام کے پاس کیمیائی ہتھیار ہیں۔ امریکہ نے سفارتی اور معاشی پابندیوں کی دھمکی دی' لیکن شام نے اس کا کوئی اثر نہ لیا۔ تاہم ابھی تک امریکہ کے عزائم میں شام' ایران اور پاکستان شامل ہیں۔ مقصد اِن کو کمزور کرنا ہے تاکہ خطے میں اسرائیل کو مضبوط سے مضبوط تر بنا کر اسلامی قوتوں کو ابھرنے نہ دیا جائے۔